زخم جو بولتے ہیں

(افسانے)

بشیر اطہر

کشمیر کی نئی پود تیزی سے افسانہ نگاری کی طرف راغب ہو رہی ہے۔ ان میں کچھ قلمکار اخبارات اور رسائل میں تواتر کے ساتھ چھپ رہے ہیں۔ ان نوجوان قلمکاروں میں بشیر آطہر بھی شامل ہیں۔ مجھے ان کے کئی افسانے پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ بشیر آطہر اپنے افسانوں میں مختلف نوعیت کے وہ موضوعات بیان کرتے ہیں جن میں آس پاس کا عکس دیکھا جاسکتا ہے، آس پاس کی زندگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ یوں تو عام واقعات کو عام فہم اور رواں زبان میں پیش کرنا آسان لگتا ہے لیکن یہ کام آسان نہیں ہے۔ اس کے پسِ پردہ تخیل کے ساتھ مشاہدہ بھی درکار ہے اور تجربات کا دخل لازمی ہے۔ بشیر آطہر اپنے آس پاس کے زخم اپنے افسانوں میں بیان کرنے کا ہُنر جان چکے ہیں اور جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے افسانوں کے عنوانات اکثر ان کے تحریر کردہ افسانوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ ابھی ان کا ادبی سفر طویل ہے اس لئے افسانہ تحریر کرتے وقت ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کے افسانوی کردار قلم اور انگلی چھوڑ کر کہیں اور نہ نکل جائیں۔ وہ اپنی کوشش میں کامیاب نظر آتے ہیں....

بشیر اطہر کو "زخم جو بولتے ہیں" کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

کشمیر کی

رف راغب ہورہی

ر رسائل میں تواتر

جوان قلمکاروں میں

کے کئی افسانے پڑھے

سانوں میں مختلف نوع

ں جن میں آس پاس

ی زندگی کا احساس ہو

عام فہم اور رواں زبان

کام آسان نہیں ہے۔

شاہدہ بھی درکار ہے اور

پنے آس پاس کے زخم ا

ن چکے ہیں اور جانے

سانوں کے عنوانات اکثر

رتے ہیں۔ ابھی ان کا

یر کرتے وقت ان کی کہ

ردار قلم اور انگلی چھوڑ کر

کوشش میں کامیاب نظر

بشیر اطہر کو "زخم جو بولتے ہیں"

زخم جو بولتے ہیں

(افسانے)

بشیر اطہر

7006259067
8803399180

جی۔این۔کے پبلی کیشنز

(نئی دھلی/ جموں و کشمیر)

© جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ!

ZAKHM JO BOLTE HAIN

(Short Stories)

By

BASHIR ATHAR

Year of First Edition: 2025
ISBN: 978-93-47359-37-8
Price ₹499

نام کتاب : زخم جو بولتے ہیں (افسانے)
مصنف : بشیر اطہر
طبع دوم : 2025
صفحات : 196
قیمت : 499/روپے
تعداد : 400
مطبع : جی۔این۔کے پرنٹرس، نئی دہلی
ناشر : جی۔این۔کے پبلی کیشنز (نئی دہلی/جموں وکشمیر)

Published by
GNK PUBLICATIONS
Head Office : Main Road, Nowhar, Near Chaaryaar Masjid
Charari Sharief, Budgam - 191112 (J&K)
Mobile : +91-7006738304 / +91-9541123110
E-mail : gnkpublications@gmail.com
www.gnkpublications.com

انتساب

اپنے والدین، بہن بھائیوں کے نام

جنھوں نے مجھے لفظوں کی پہچان دی۔

اپنی شریکِ حیات اور بچوں بنت الزہراء اور انصار کے نام

جنھوں نے میرے لکھنے کو خاموش حوصلہ دیا۔

اپنے مرحوم چچا محمد اکبر میر کے نام

جن کی رہنمائی سے علم کا سفر ممکن ہوا۔

اپنے اساتذہ کے نام

جنھوں نے یقین بخشا۔

اور اُن دوستوں کے نام

جو وقت کی دھند میں کھو گئے ،

مگر آج بھی یادوں کے چراغ روشن کیے ہوئے ہیں۔

☆☆

فہرست

○	آغازِ سخن	بشیر اطہر	09
○	تاثرات	نور شاہ	12
○	اردو افسانے کا معتبر نام......	ڈاکٹر احسان عالم	13
○	بشیر اطہر بحیثیتِ افسانہ نگار	ڈاکٹر غلام نبی کمار	17

افسانے

1	سراغ	22
2	مشتبہ	24
3	دھند	27
4	قرضہ	31
5	چنار کا پیڑ	34
6	زخم جو بولتے ہیں	37
7	ادھورے سپنے	41
8	انتظار	45

9	اولڈ ایج ہوم	49
10	امانت کا درخت	53
11	ماں کی تڑپتی روح	56
12	چاندرات کا مہمان	60
13	اس شب	70
14	ڈھول	72
15	کون مرا	74
16	بالیاں	78
17	خوشیوں کا گہوارہ	82
18	لڑائی	85
19	سایہ	88
20	واردات	92
21	توبہ قبول ہوئی	96
22	بموں کی کہانی	99
23	بند کمرہ	103
24	افواہ	107
25	خسرہ نمبر	112
26	سفر تنہائی کا	116
27	ٹیگور ہال میں دفن خواب	120
28	بابا! یہ میں ہوں......	123

29	قیدی نمبر دوسودو	126
30	آواز دو کہاں ہو	129
31	کچہریوں کا چکر	132
32	اور خوشی مرگئی	137
33	میں ایسا کیوں بنوں	139
34	شادی	141
35	ڈاکٹر کا نسخہ	142
36	موت کے فرشتے	144
37	اجڑا مسافر گھر کو لوٹ آیا	145
38	کیا انصاف ہے!	148
39	یہ پتھر ہے	150
40	خط جو ابھی تک نہیں کھلا تھا	152
41	رسم رونمائی	155
42	اینٹ کا جواب پتھر سے	156
43	کفن چور	158
44	کھیل شروع ہوا......مگر!	160
45	سرد آہیں اور بس!	163
46	خون کی ہولی	166
47	یاد ہے نا	169
48	تنہائی	172

49	انصاف بک گیا	175
50	بدچلن عورت	176
51	کوٹھے پر	177
52	جج دیکھتا رہا	179
53	بچے پالنے ہیں	180
54	جنت کی سند	181
55	پاگل شہر	182
56	کچھ یادیں	183
57	گِدوں کی دنیا میں	184
58	ہر چہرہ پریشان	187
59	ہم دور ہوتے گئے	190
60	افسانہ	193

☆☆

آغازِ سخن

لفظوں کی اس بے کنار دنیا میں، جہاں ہر حرف اپنے اندر ایک مکمل کائناتِ احساس، ایک گمشدہ ہیولیٰ، ایک خاموش چیخ یا ایک لرزتا ہوا نور چھپائے بیٹھا ہے، میں یہ چند ابتدائی سطور آپ کی خدمت میں اس امید کے ساتھ سپردِ قلم کر رہا ہوں کہ آپ انہیں محض ایک رسمی دیباچہ تصور نہ کریں۔ یہ وہ کیفیت ہے جو ایک تخلیق کار کے دل میں اس وقت مچلتی ہے جب وہ اپنے خوابوں، تجربوں اور احساسات کے بوجھ سے لرزتے ہاتھوں کے ساتھ اپنی پہلی کتاب قارئین کے سپرد کرتا ہے۔ گویا لفظوں کی ایک پوری دنیا، برسوں کے اندرونی اضطراب کے بعد، ایک لمحے میں خود کو آپ کے سامنے کھول دیتی ہے۔

''زخم جو بولتے ہیں'' میرا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ ایک ایسی دھڑکن جو میری روح کی گہرائیوں سے پھوٹی ہے، جسے میں نے زمانے کے طویل امتحانات، زندگی کے کڑی دھوپ جیسے تجربات، راتوں کی تنہائی میں ٹپکتے ہوئے بے نام آنسوؤں اور امید کے ان باریک تاروں سے بُنا ہے جو بہت کم لوگوں کو دکھائی دیتے ہیں مگر ایک تخلیق کار کو ہمیشہ تھام کر رکھتے ہیں۔ میرا ارادہ یہ نہیں کہ آپ اسے چند منٹ کی مصروفیت یا محض مطالعے کا سامان سمجھ کر پڑھ ڈالیں، بلکہ یہ ہے کہ ہر افسانہ آپ کے ذہن اور دل کے کسی نہ کسی گوشے میں ایک مستقل عکس چھوڑے۔ ایسا عکس جو آپ کے شعور پر ہلکی سی دستک بھی دے اور آپ کے باطن میں ایک خاموش ارتعاش بھی پیدا کرے۔

افسانہ اپنی پوری معنویت، اپنی باطنی گہرائی اور اپنی لطیف ترین رنگت اسی وقت ظاہر کرتا ہے جب قاری اس کے باطن میں اترنے کی جرأت رکھے۔ جب وہ کرداروں کے زخم اپنے دل پر محسوس کرے، ان کی ہجرتوں اور محرومیوں کو اپنے وجدان میں جگہ دے، جب وہ منظرنامے کو محض پڑھتا نہیں بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے۔ ورنہ الفاظ کا سفر، خواہ وہ کتنے ہی کاوش سے کیوں نہ لکھے گئے ہوں، سطح پر تیرتا رہتا ہے اور کبھی روح کی تہوں تک رسائی نہیں پاتا۔

میں نے اس مجموعے کو خونِ جگر سے لکھا ہے۔ لفظ لفظ میرے اندر سے نکلا ہے، جیسے کوئی چراغ اندھیرے سے کاٹا جاتا ہو۔ جملہ جملہ میری کمزوریوں، میری امیدوں، میرے خوفوں اور ان شکستگیوں کا اعتراف ہے جو انسان کو اندر سے پختہ بھی کرتی ہیں اور توڑ بھی دیتی ہیں۔ پھر بھی، میں کامل ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا، کیونکہ ادب کی دنیا میں کمال وہ منزل ہے جس تک پہنچنے کا سفر تو جاری رہتا ہے، مگر منزل ہمیشہ ایک قدم آگے سرکتی جاتی ہے۔

یہ مجموعہ یقیناً انسانی کوشش کا حاصل ہے، اس لیے اس میں غلطیوں اور خامیوں کا امکان موجود ہے۔ اگر کہیں فکری کمزوری، فنی لغزش، اسلوبی بھٹکاؤ یا اصطلاحی بے ربطی آپ کی نظر میں آئے تو یہ میری خامی نہیں بلکہ آپ کی بالغ نظری اور گہرے ذوق کا ثبوت ہوگا۔ اہلِ نقد و دانش کی رہنمائی ہی وہ چراغ ہے جس سے تخلیق کار کو اپنے آنے والے سفر کے نئے راستے دکھائی دیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کا ایک جملہ، ایک نشان دہی، ایک نرم سی سرزنش، میرے قلم کو آئندہ اور زیادہ سنورنے کا ہنر عطا کر جائے۔ آخرکار ادیب کی اصل کمائی اس کی تعریف نہیں، بلکہ وہ آگہی ہے جو اسے اپنی کوتاہیوں سے روشناس کرواتی ہے اور آگے بڑھنے کا حوصلہ بخشتی ہے۔

لہٰذا اس مجموعے کو پڑھتے ہوئے اسے ایک نو آموز مسافر کے پہلے اعترافِ سفر کے طور پر دیکھیں۔ ایسے مسافر کی داستان کے طور پر جو ابھی راستوں کی دھول سے ناواقف نہیں، مگر جن منزلوں کو پالینے کی آرزو اس کے دل میں بجھتی نہیں۔ میری آرزو بس اتنی ہے کہ یہ افسانے آپ کے دلوں تک پہنچیں، آپ کی تہہِ دل میں کہیں کوئی خاموش لہر پیدا کریں اور آپ کے احساسات میں ایک ایسا منتشر سا نشان چھوڑ جائیں جو دیر تک مٹنے نہ پائے۔

بشیر اطہر

خانپورہ، کھاگ

☆☆

اردو افسانے کا معتبر نام: ''زخم جو بولتے ہیں''

ناول کی طرح افسانے میں بھی کردار کے مختلف پہلوؤں کو دکھایا جا سکتا ہے، لیکن افسانے میں کہانی کا دائرہ محدود ہونے کی وجہ سے وہ کسی خاص پہلو کے ساتھ سامنے آتا ہے اور اس کردار کے اہم پہلوؤں کو نمایاں کر کے افسانہ نگار اپنے مقصد کی باتیں کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ نگار کو کردار نگاری کے لیے کافی محنت کرنی پڑتی ہے اور سوچ سمجھ کر اسے پیش کیا جاتا ہے تا کہ وہ قاری کے دل میں گھر کر سکے۔ کردار کا ارتقا بھی بہت اہم ہوتا ہے۔ ناول میں تو کردار کا ارتقا آسانی سے دکھایا جا سکتا ہے لیکن افسانہ کا دائرہ محدود ہونے کی وجہ سے کردار کا ارتقا دکھانا مہارت کا کام ہے۔ بعض نئے افسانہ نگاروں نے کردار کو اہمیت نہیں دی ہے۔ ان کے افسانوں میں کردار نہیں ہوتے ہیں بلکہ صرف کہانی کے ذریعہ افسانہ آگے بڑھتا ہے۔

افسانے میں نقطۂ نظر کی بڑی اہمیت ہے۔ دیکھا جائے تو ہر کوئی اپنا خاص نقطۂ نظر رکھتا ہے اور اسی کو پیش کرنے کے لیے قلم کار لکھنا شروع کرتا ہے۔ اسی طرح افسانہ نگار کا ایک نقطۂ نظر ہوتا ہے جسے وہ اپنے افسانے میں پیش کرتا ہے۔ یہی نقطۂ نظر ہی پلاٹ اور کردار کی عمارت بھی کھڑی کرتا ہے۔ یعنی پلاٹ اور کردار اسی نقطۂ نظر یا مرکزی خیال کے ارد و گرد گھومتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری یہ ہے کہ نقطۂ نظر بہت زیادہ واضح اور نمایاں نہ ہو۔ بلکہ اشاروں کا سہارا لیا جائے۔ یعنی کوئی بھی مقصد کی بات کھل کر نہیں کی جاتی ہے بلکہ سب کچھ اشاروں میں بیان کیا جاتا ہے۔

ماحول اور فضا بھی افسانے میں اہم مانا جاتا ہے۔ یعنی کہانی میں ماحول کی تصویر اس

تاثرات

کشمیر کی نئی پود تیزی سے افسانہ نگاری کی طرف راغب ہو رہی ہے۔ان میں کچھ قلمکار اخبارات اور رسائل میں تواتر کے ساتھ چھپ رہے ہیں۔ان نوجوان قلمکاروں میں بشیر اطہر بھی شامل ہیں۔ مجھے ان کے کئی افسانے پڑھنے کا موقع ملا ہے۔بشیر اطہر اپنے افسانوں میں مختلف نوعیت کے وہ موضوعات بیان کرتے ہیں جن میں آس پاس کا عکس دیکھا جا سکتا ہے، آس پاس کی زندگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔یوں تو عام واقعات کو عام فہم اور رواں زبان میں پیش کرنا آسان لگتا ہے لیکن یہ کام آسان نہیں ہے۔اس کے پسِ پردہ تخیل کے ساتھ مشاہدہ بھی درکار ہے اور تجربات کا دخل لازمی ہے۔بشیر اطہر اپنے آس پاس کے زخم اپنے افسانوں میں بیان کرنے کا ہنر جان چکے ہیں اور جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ان کے افسانوں کے عنوانات اکثر ان کے تحریر کردہ افسانوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ ابھی ان کا ادبی سفر طویل ہے اس لئے افسانہ تحریر کرتے وقت ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کے افسانوی کردار قلم اور انگلی چھوڑ کر کہیں اور نہ نکل جائیں۔وہ اپنی کوشش میں کامیاب نظر آتے ہیں....

بشیر اطہر کو ''زخم جو بولتے ہیں'' کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

نور شاہ

سرینگر

2025/12/29

اردو افسانے کا معتبر نام: ''زخم جو بولتے ہیں''

ناول کی طرح افسانے میں بھی کردار کے مختلف پہلوؤں کو دکھایا جاسکتا ہے، لیکن افسانے میں کہانی کا دائرہ محدود ہونے کی وجہ سے وہ کسی خاص پہلو کے ساتھ سامنے آتا ہے اور اس کردار کے اہم پہلوؤں کو نمایاں کر کے افسانہ نگار اپنے مقصد کی باتیں کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ نگار کو کردار نگاری کے لیے کافی محنت کرنی پڑتی ہے اور سوچ سمجھ کر اسے پیش کیا جاتا ہے تاکہ وہ قاری کے دل میں گھر کر سکے۔ کردار کا ارتقا بھی بہت اہم ہوتا ہے۔ ناول میں تو کردار کا ارتقا آسانی سے دکھایا جاسکتا ہے لیکن افسانہ کا دائرہ محدود ہونے کی وجہ سے کردار کا ارتقا دکھانا مہارت کا کام ہے۔ بعض نئے افسانہ نگاروں نے کردار کو اہمیت نہیں دی ہے۔ ان کے افسانوں میں کردار نہیں ہوتے ہیں بلکہ صرف کہانی کے ذریعہ افسانہ آگے بڑھتا ہے۔

افسانے میں نقطۂ نظر کی بڑی اہمیت ہے۔ دیکھا جائے تو ہر کوئی اپنا خاص نقطۂ نظر رکھتا ہے اور اسی کو پیش کرنے کے لیے قلم کار لکھنا شروع کرتا ہے۔ اسی طرح افسانہ نگار کا ایک نقطۂ نظر ہوتا ہے جسے وہ اپنے افسانے میں پیش کرتا ہے۔ یہی نقطۂ نظر ہی پلاٹ اور کردار کی عمارت بھی کھڑی کرتا ہے۔ یعنی پلاٹ اور کردار اسی نقطۂ نظر یا مرکزی خیال کے اردو گرد گھومتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری یہ ہے کہ نقطۂ نظر بہت زیادہ واضح اور نمایاں نہ ہو۔ بلکہ اشاروں کا سہارا لیا جائے۔ یعنی کوئی بھی مقصد کی بات کھل کر نہیں کی جاتی ہے بلکہ سب کچھ اشاروں میں بیان کیا جاتا ہے۔

ماحول اور فضا بھی افسانے میں اہم مانا جاتا ہے۔ یعنی کہانی میں ماحول کی تصویر اس

طرح پیش کی جاتی ہے کہ اس سے پوری فضا سامنے آجاتی ہے۔ اس کے سہارے وہ اپنی کہانی لکھتا ہے اوراسی کے سہارے ماحول اور فضا کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ لیکن یہاں بھی اشاروں میں اس کی تصویر پیش کی جاتی ہے۔

اسلوب اور انداز بیان کی اہمیت تو ہر صنف ادب میں ہے لیکن افسانے میں اسلوب کی اہمیت کچھ زیادہ ہی ہے۔ یہاں تک کہ افسانے کی مقبولیت یا غیر مقبولیت کا دارو مدار اسی پر ہوتا ہے۔ چونکہ افسانے کا دائرہ بہت چھوٹا ہوتا ہے اس لیے اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ کم لفظوں میں زیادہ بات کہہ دی جائے۔ ایسا انداز اپنایا جائے جس سے قاری کو پڑھ کر لطف آئے اور کسی بھی طرح کا الجھن اس کے اندر پیدا نہ ہو۔ اسی طرح افسانے میں سادگی اور دلکشی ہونا افسانے کی کامیابی کی دلیل ہے۔ افسانوں میں الفاظ، جملے یا فقرے کو سوچ سمجھ کر اختیار کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ افسانہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ زبان و بیان پر قدرت رکھتا ہو۔ بہر حال غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اسلوب اور انداز بیان افسانہ نگاری کے لیے ضروری ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے افسانہ ایسا ہو کہ کہانی شروع ہوتے ہی پڑھنے والا اس کی طرف متوجہ ہو جائے اور دلچسپی سے پڑھتا جائے اور ساتھ ہی اس کے اندر یہ خواہش پیدا ہو کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ اس طرح یہ خواہش آخر تک برقرار رہے۔ پھر جب افسانہ ختم ہو تو پڑھنے والے کے دل پر وہ ایک گہرا نقش چھوڑ جائے۔

یہ ساری خوبیاں بشیر اطہر کے افسانوی مجموعے ''زخم جو بولتے ہیں'' کے افسانوں میں موجود ہیں۔ یہ بشیر اطہر کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ ان کے افسانوں میں زندگی کے مسائل کی عکاسی بڑی چابکدستی سے کی گئی ہے۔ افسانہ نگار اپنے افسانوی مجموعہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''لفظوں کی اس بے کنار دنیا میں جہاں ہر طرف اپنے اندر ایک مکمل کائنات احساس، ایک گمشدہ ہیولیٰ، ایک خاموش چیخ یا ایک لرزتا ہوا نور چھپائے بیٹھا ہے، میں یہ ابتدائی سطور آپ کی خدمت میں اس امید کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ اسے رسمی دیباچہ تصور نہ

کریں۔ یہ وہ کیفیت ہے جو ایک تخلیق کار کے دل میں اس وقت مچلتی ہے جب وہ اپنے خوابوں، تجربوں اور احساسات کے بوجھ سے لرزتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ اپنی پہلی کتاب قارئین کے سپرد کرتا ہے۔''

بشیر اطہر کے افسانوں پر اپنے تاثرات رقم کرتے ہوئے معروف افسانہ نگار نور شاہ لکھتے ہیں کہ ''کشمیر کی نئی پود تیزی سے افسانہ نگاری کی طرف راغب ہو رہی ہے۔ ان میں کچھ قلمکار اخبارات اور رسائل میں تواتر کے ساتھ چھپ رہے ہیں۔ ان نوجوان قلمکاروں میں بشیر اطہر بھی شامل ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں مختلف نوعیت کے وہ موضوعات بیان کرتے ہیں جن میں آس پاس کا عکس دیکھا جا سکتا ہے، آس پاس کی زندگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔

اب بشیر اطہر کے چند افسانوں کا جائزہ پیش کرتے ہوئے ان کی خوبیوں کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ ''زخم جو بولتے ہیں'' کا پہلا افسانہ ''سراغ'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں موصوف نے عصر حاضر کی انسانی زندگی کے پیچ وخم کو پیش کیا ہے۔ آج انسان نے اپنے دماغ کا استعمال کرنا چھوڑ دیا ہے۔ وہ مشینوں پر زیادہ اعتبار کرنے لگا ہے اور اس پر منحصر بھی ہونے لگا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی زندگی درہم برہم ہوتی جاتی ہے۔ اللہ نے جس مقصد سے زندگی دی تھی وہ فوت ہوتی جا رہی ہے۔ آج زندہ ہونے کے باوجود بھی انسان مردہ نظر آتا ہے۔ وہ بے بسی کے ساتھ جینے پر مجبور ہے۔ افسانہ نگار یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ انسان اپنی زندگی کے مقصد کو سمجھے۔ مشین کی جگہ اپنے دماغ سے کام لے۔ اللہ نے انسان کے دماغ میں بڑی وسعت رکھی ہے۔

بشیر اطہر کا ایک اور افسانہ ''دھند'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں شکنتلا بھیم راؤ کی بیٹی ہے۔ وہ بڑے ناز و ادا کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کی تیار کرتا ہے۔ ایک دن وہ مر جاتا ہے۔ انتم سنسکار کے کچھ دنوں بعد سکھ رام، شکنتلا کی شادی اپنے بیٹے سے کرتا ہے۔ شکنتلا کی شادی کے بعد اس گھر والے اسے نہیں اپنا پاتے ہیں۔ ایک دن شور ہوتا ہے کہ شکنتلا گھر سے

بھاگ گئی ہے۔ لوگ اس کی تلاش میں باہر نکلتے ہیں۔ اس کی لاش ایک پیڑ سے لٹکی ہوئی ملتی ہے۔ افسانہ نگار نے سماج کے المیہ کو اس افسانہ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہنا چاہتا ہے کہ بڑے ارمان کے ساتھ لوگ اپنی بیٹیوں کی شادی کرتے ہیں لیکن اسے وہ حق نہیں دیا جاتا ہے جس کی ایک بیٹی مستحق ہوتی ہے۔ اس کے نتائج بہت ہی خطرناک ہوتے ہیں۔

بشیر اطہر کا ایک اہم افسانہ ''زخم جو بولتے ہیں'' کے عنوان سے ہے۔ یہی عنوان کتاب کا بھی ہے۔ یہ رومانی افسانہ ہے۔ ایک بوڑھا سنسان پل کے سائے تلے روزانہ آکر بیٹھتا ہے۔ ایک دن اس کی ملاقات اسکولی بچے احتشام سے ہو جاتی ہے۔ وہ بچہ بوڑھے سے طرح طرح کا سوال کرتا ہے۔ پہلے تو بوڑھا ٹالنے کی کوشش کرتا ہے لیکن آخر میں وہ جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ بیٹا! کچھ زخم ایسے ہوتے ہیں جو دل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ زخم کبھی نہیں بھرتے۔ بوڑھے کی آنکھوں میں ہزاروں راتوں کا بوجھ تھا۔ مزید وہ کہتا ہے ہاں بیٹا زخم بولتے ہیں۔ جسم کے زخم وقت بھر دیتا ہے۔ دل کے زخموں کا کوئی علاج نہیں۔

اس طرح بشیر اطہر کے تقریباً تمام افسانے ہمیں متاثر کرتے ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعہ کی اشاعت کے لئے دل سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

☆☆

ڈاکٹر احسان عالم
پرنسپل الحراء پبلک اسکول، دربھنگہ

بشیر اطہر بحیثیت افسانہ نگار

کشمیر ہندوستان کا ایک ایسا خطہ ہے جہاں تخلیق کاروں کی ایک نئی پود بڑی تیزی سے منظر عام پر آ رہی ہے۔ ان تخلیق کاروں میں شاعروں اور افسانہ نگاروں کی تعداد زیادہ ہے۔ جبکہ ناول اور تحقیق و تنقید کا معاملہ کافی حد تک سست دکھائی پڑتا ہے۔ مختلف جامعات میں جو اسکالر حضرات تحقیقی مقالات لکھ رہے ہیں، انہی کے مقالے وقتاً فوقتاً شائع ہو رہے ہیں۔ آپ کسی شخص کو تحقیق و تنقید کے میدان میں سنجیدہ نہیں پائیں گے۔ اس سے جو خدشات جنم لے رہے ہیں، میں اس کے پس منظر میں نہیں جانا چاہوں گا۔

رہی بات کشمیر میں لکھے جا رہے فکشن ادب کی، تو یہ میدان تخلیقی فن کاروں کی بدولت بڑا سیراب نظر آتا ہے۔ فکشن ادب میں مختصر افسانہ یہاں کے نوجوان ادبا کی پسندیدہ صنفِ سخن ہے۔ مختصر افسانہ لکھنے والے نوجوانوں کی بڑی کھیپ سامنے آ رہی ہے جس سے یہاں کا ادبی ماحول بڑا خوش کُن کہا جا سکتا ہے۔

میں یہاں ایک ایسے نوجوان افسانہ نگار کا تذکرہ کرنے جا رہا ہوں جو گزشتہ چند برسوں سے ادبی منظر نامے پر تخلیقات کی مسلسل اشاعت سے قارئین کے دلوں میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ وہ نوجوان قلم کار کوئی اور نہیں بشیر اطہر ہیں جن کے افسانے جموں و کشمیر کے مختلف روزناموں اور رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ بشیر اطہر کسی استاد سے اصلاح نہیں لے رہے ہیں۔ وہ افسانوں کو طوالت نہیں دیتے، بلکہ موضوع کو کم لفظوں میں سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بشیر اطہر کے افسانوں کا مجموعہ ''زخم جو بولتے ہیں'' میں کچھ افسانچے بھی شامل

کیے گئے ہیں۔ان کے افسانوی مجموعے میں تخلیقات کی تعداد تقریباً 60 ہے۔جن میں ''سراغ''، ''ڈھول''، ''توبہ قبول ہوئی''، ''سفر تنہائی کا''، ''میں ایسا کیوں بنوں''، ''اجڑا مسافر گھر کو لوٹ آیا''، ''کفن چور''، ''انصاف بِک گیا'' وغیرہ جیسے عنوانات کے تحت افسانے شامل اشاعت ہیں۔بشیر اطہر کے افسانوں کو قاری ایک ہی نشست میں ختم کر سکتا ہے۔ان کے افسانوں کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ وہ افسانوں کی طوالت سے گریز کرتے ہیں۔اگر موضوعی اعتبار سے ان کے افسانوں کا جائزہ لیا جائے تو وہ سیاسی، سماجی، معاشرتی اور اخلاقی پہلوؤں کو بڑے اعتماد کے ساتھ اجاگر کرتے نظر آتے ہیں۔ہم جن چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کر کے آگے بڑھتے ہیں، بشیر اطہر انہیں ہنر مندی کے ساتھ افسانوی قالب میں ڈھالتے ہیں۔

بشیر اطہر کے افسانوں کا نمایاں پہلو انسانی درد کو محسوس کرنا اور اس کے جذبات کو اُبھارنا ہے۔وہ انسانی جذبات کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیتے ہیں اور اس کے درد کو اپنا درد سمجھ کر بیان کرتے ہیں۔''زخم جو بولتے ہیں'' بشیر اطہر کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جس میں متفرق موضوعات پر افسانے موجود ہیں جو انسانی زندگی کے مختلف گرہوں کو کھولتے ہیں اور پھر اس کا نچوڑ پیش کرتے ہیں۔اس مجموعے کا پہلا افسانہ ''سراغ'' ہے جس میں افسانہ نگار نے خواب میں انسان کی بے حِسی، بے دِلی اور احساسِ مروت سے عاری جذبات کو نمایاں کیا ہے۔وہ جیسا خواب میں دیکھتا ہے، حقیقت میں بھی انسان کو ویسا ہی پاتا ہے لیکن چند ایک کو چھوڑ کو اس کو انسان کی ہنسی بھی ایک مصنوعی آلے جیسی لگتی ہے۔دراصل افسانہ نگار کو جس سراغ کی تلاش ہوتی ہے وہ سراغ اسے چند باضمیر لوگوں میں مل جاتا ہے۔اس افسانے میں افسانہ نگار نے سماج کے دو خاص پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے، جس میں مثبت اور منفی دونوں رجحان پائے جاتے ہیں نیز جو افسانے کے موضوع میں یکسانیت پیدا کرتا ہے۔مجموعے میں ایک افسانہ ''دھند'' شامل ہے جس میں باپ بیٹی کے پیار محبت، اپنوں کی دوری اور جدائی و کرب اور اپنوں ہی کے ظلم و ستم کو چابکدستی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔''دھند''

میں بھیم راؤ کے بیٹے کا اپنے وطن اور باپ کو چھوڑ کر غیر ملک میں آباد ہونا، اور بھیم راؤ کا اپنی بیٹی شکنتلا کو ماں باپ دونوں کا پیار دینا اور عین موقع پر اس کے انتقال سے شکنتلا کی زندگی میں ظلم وستم کا پہاڑ ٹوٹ پڑنا وغیرہ کو عمدگی سے دکھایا گیا ہے، آخر میں شکنتلا کی خودکشی ایک یتیم اور لاچار بیٹی کی زندگی کا کرب ہے۔اس افسانے سے پتہ چلتا ہے کہ رشتوں کی ڈور کتنی کمزور پڑتی جارہی ہے۔

''زخم جو بولتے ہیں'' افسانہ جو کہ پیش نظر مجموعے کا نام بھی ہے، میں افسانہ نگار نے ایک ستم زدہ اور شکست خوردہ بزرگ شخص کے زخموں کی داستان پیش کی ہے، افسانہ نگار نے ابتداً ایک ایسے پُل کا ذکر چھیڑا ہے جس پر کبھی انسانوں کی چہل قدمی رہتی تھی اور جو کبھی اپنی رنگینی اور مضبوطی کے لیے جانا جاتا تھا، لیکن آج وہ پُل زنگ آلودہ ہے، اس کے علاوہ پُل کے نیچے گزرنے والی ندی کی خستہ حالی پر بھی وہ ماتم کناں ہے۔افسانہ نگار پُل اور ندی کی دلکشی سے مشابہت دیتے ہوئے اُس بزرگ شخص کے دورِ شباب کا ذکر بھی چھیڑتے ہیں، جو آج پُل اور ندی کی طرح بے بس ومحتاج دکھائی دیتے ہیں، اور کسی کے رحم وکرم کے متمنی ہیں۔اس افسانے سے دراصل یہ سبق ملتا ہے کہ ہم بہت جلد ماضی کی یادوں اور ان کی اہمیت کو فراموش کردیتے ہیں اور جہاں دھوپ وہاں چھاؤں اور جہاں چھاؤں وہاں دھوپ کے مصداق اس کی مثال ملتی ہے۔

''ادھورے سپنے''، لعل دین جیسے محنت کش اور دیانت دار مزدور کی کہانی ہے جس کا خواب اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بنانا ہوتا ہے۔لیکن ایک دن جب لعل دین بیمار پڑ جاتا ہے، اور اس کے بہتر علاج کے لیے اسے ایک اچھے ڈاکٹر کو دکھایا جاتا ہے، تو ڈاکٹر ڈھائی ہزار روپے کی دوائی دیتا ہے، جب کہ لعل دین کی جیب سے محض تین سو روپے ہی نکلتے ہیں، بدلے میں ڈاکٹر کا مریض کے تئیں مایوس کن روّیہ اس کے بیٹے شوکت کا ڈاکٹری پیشے سے نفرت کا سبب بنتا ہے، جس کا خواب ڈاکٹر بننا تھا وہ بالآخر مستری بن جاتا ہے۔اس افسانے میں انسانیت اور انسانی زندگی پر پیسوں کی فوقیت کو نمایاں کیا گیا ہے اور دوسری طرف ایک ڈاکٹر کو انسانی

ہمدردی سے عاری دکھا گیا ہے۔ افسانہ ''ماں کی تڑپتی روح'' بھی انسانی رشتوں کی زندہ مثال پیش کرتا ہے۔ جس میں چچا کا اپنے خونی رشتوں کو اذیت پہنچانا، معصوم بچوں کو در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کرنا، ایک ہندو مذہب کے انسان کا مسلمان مذہب کے بچوں کو آسرا دے کر انھیں اپنی اولاد جیسا پیار دینا اور اونچے منصب پر پہنچانا، اونچا مقام پانے کے بعد اذیت پہنچانے والے چچا کو معاف کرنا دراصل ایک انسان کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے۔ جو انسان زخم کھا سکتا ہے، اس میں بدلہ لینے کے بجائے معاف کرنے کی سکت بھی رکھی ہے۔ یہاں انسانیت کے مختلف روپ دکھائے گئے ہیں۔

بشیر اطہر کے اس مجموعے میں کئی افسانے مثلاً ''کون مرا''، ''بالیاں'' اور ''سفر تنہائی کا'' وغیرہ خونی رشتوں کی حقیقت کو آشکار کرتا ہے۔ ان افسانوں میں افسانہ نگار نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ سبھی رشتوں کی زنجیر مضبوط نہیں ہوتی، کچھ رشتوں میں محبت، اپنوں کی قربت اور ہمدردی کا جذبہ برقرار نہیں رہتا۔ ''سفر تنہائی کا'' میں والدین اپنے بچوں کے بہتر اور روشن مستقبل کے لیے انہیں ولایت بھیج دیتے ہیں، بدلے میں انھیں مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا، یہاں تک کہ بچوں کے ہاتھوں کی مٹی بھی نصیب نہیں ہوتی۔

''بند کمرہ'' ایک نفسیاتی نوعیت کی کہانی ہے جس میں انسانی خواہشات کو قابو میں رکھنے کی تلقین کی گئی ہے۔ بشیر اطہر کے دیگر افسانے بھی موضوع کے اعتبار سے ایک پیغام دیتے ہیں۔ ان کی کہانیاں سماجی، معاشی اور اقتصادی پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے۔ چوں کہ انسان میں سماجی اور اقتصادی اعتبار سے لچک ہونا ضروری ہے، معمولی کمزوری بھی اس کے وقار کو ٹھیس پہنچا سکتی ہے۔ بشیر اطہر نے ان چیزوں کو بڑی خوبی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔

''زخم جو بولتے ہیں'' بشیر اطہر کی افسانہ نگاری کی پہلی سیڑھی ہے، گویا وہ جوں جوں زینے طے کرتے جائیں گے، اتنا ہی اُن کے افسانوں میں گہرائی و گیرائی اور فنی پختگی بھی پیدا ہوتی جائے گی۔ جہاں موضوعی سطح پر ان کے افسانوں میں تنوع پیدا ہوگا وہیں تکنیکی لحاظ سے بھی وہ مزید کئی عمدہ افسانے پیش کر سکتے ہیں۔ جہاں تک فاضل افسانہ نگار کی زبان

و بیان کا تعلق ہے، تو اس میں موصوف دیگر نوجوان افسانہ نگاروں سے کافی حد تک بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

بشیر اطہر جس لگن اور محنت کا مظاہرہ کر رہے ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب وہ نمائندہ نسل کے افسانہ نگاروں میں ایک اہم مقام بنانے میں کامیاب ہوں گے۔

میں بشیر اطہر کو ان کے مجموعے ''زخم جو بولتے ہیں'' پر انھیں صمیم قلب سے مبارک باد پیش کرتا ہوں اور ان کے روشن مستقبل کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا گو ہوں۔

ڈاکٹر غلام نبی کمار

(ایڈیٹر سہ ماہی ''پنج آب'')

☆☆

سراغ

انسان وہ نہیں جو سانس لے، بلکہ وہ ہے جو محسوس کرے، سوچے، اور کسی کے درد میں اپنا دل دھڑکتا پائے۔ یہی ہے زندگی، یہی ہے سراغ۔ رات کے پچھلے پہر میں نے خواب دیکھا..... میں ایک ایسے شہر میں ہوں جہاں سب لوگ زندہ ہیں مگر ان میں زندگی نہیں۔ آنکھیں کھلی تھیں، مگر چہرے بے نور۔ ہونٹ ہنس رہے تھے مگر دل مردہ۔ میں چونک کر جاگا۔ پسینہ میری پیشانی پر جم چکا تھا۔ میں نے سوچا، شاید یہ کوئی ڈراؤنا خواب تھا۔ مگر اگلی صبح جب میں بیدار ہوا تو محسوس ہوا، یہ خواب نہیں، حقیقت تھی۔ گلیوں میں، بازاروں میں، دفاتر میں......سب کے سب ایک ہی انداز میں چل رہے تھے۔ مسکراہٹیں مصنوعی، باتیں رسمی، اور جذبے مردہ۔ میں نے سوچا، یہ لوگ زندہ نہیں، بلکہ زندگی کی لاشیں ہیں۔ انہیں اپنے درد کا احساس نہیں، کسی اور کے دکھ کا شعور نہیں۔ وہ کھاتے ہیں، پیتے ہیں، چلتے ہیں، مگر محسوس نہیں کرتے۔ دن گزرتا گیا۔ میں دفتر پہنچا۔ وہاں بھی وہی فضا، وہی خموشی۔ کسی کو کسی کی پروا نہیں۔ ایک نے ہنس کر کہا...... بھائی، آج کل کے دور میں احساس پالنا کمزوری ہے۔ میں نے دل میں کہا، نہیں...... یہی تو انسانیت کی اصل طاقت ہے۔ رات کو میں نے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ وہ ایک مصنوعی روبوٹ سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کی ہنسی صاف تھی مگر روح سے خالی۔ میں نے سوچا، اب لوگ اپنی عقل پر نہیں، ایک مصنوعی دماغ پر بھروسہ کرنے لگے ہیں۔ سوچنا بھول گئے، محسوس کرنا چھوڑ دیا۔ اب ہر بات، ہر رائے، ہر

فیصلہ کسی مشین کے ہاتھ میں ہے۔ انسان خود کو سہولت کے نام پر بے جان کر رہا ہے۔ میں نے خود سے پوچھا کیا یہ ترقی ہے، یا خودکشی کی ایک مہذب شکل؟ کچھ دن بعد مجھے سرینگر کے ٹیگور ہال میں ادیبوں کی ایک نشست میں جانے کا موقع ملا۔ ہال میں روشنی تھی مگر دلوں میں اندھیرا۔ اسٹیج پر ایک معروف ادیب کھڑا تھا، کچھ پڑھ رہا تھا۔ سامعین میں بیٹھے درجنوں ادیب تالی بجا رہے تھے، بغیر سمجھے، بغیر محسوس کیے۔ میں نے ان کے چہروں کو دیکھا۔ وہ ہنس رہے تھے، مگر ان کی آنکھوں میں خالی پن تیر رہا تھا۔ پھر میری نظر ایک کونے میں بیٹھے چند ادیبوں پر گئی۔ وہ خاموش تھے، مگر ان کے چہروں پر فکر کی روشنی تھی۔ میں نے سوچا...... یہی وہ لوگ ہیں جو ابھی زندہ ہیں۔ باقی سب تو مر چکے ہیں، بس تدفین باقی ہے۔ رات گئے میں آئینے کے سامنے کھڑا ہوا۔ آئینے میں ایک چہرہ تھا... میرا اپنا چہرہ۔ میں نے اس سے پوچھا: کیا تُو بھی مر چکا ہے؟ کیا تیری مسکراہٹ بھی مصنوعی ہے؟ کیا تیرا قلم بھی صرف تالیوں کے لیے لکھتا ہے، سچ کے لیے نہیں؟۔ آئینہ خاموش رہا۔ مگر اس کی خاموشی میں ایک تلخ سچائی چھپی تھی۔ میں نے چراغ بجھا دیا۔ کمرے میں اندھیرا پھیل گیا، مگر میرے اندر ایک روشنی جاگ اٹھی۔ میں نے محسوس کیا...... شاید زندگی کا اصل سراغ انہی چند زندہ لوگوں کے پاس ہے، جو سوچتے ہیں، محسوس کرتے ہیں، اور جن کے دل اب بھی انسانیت کے لیے دھڑکتے ہیں۔ میں نے جان لیا کہ زندہ رہنے کے لیے سانس لینا کافی نہیں احساس، شعور، اور درد کا ہونا ضروری ہے۔ یہی ہے انسان ہونے کا سراغ۔

☆☆

مشتبہ

میں ہمیشہ سے یہ خواہش رکھتا تھا کہ اپنے بارے میں کچھ لکھوں...... مگر ایسا کچھ جو میرے ماضی اور حال دونوں کی عکاسی کرے۔ وہ زمانہ بھی یاد آتا ہے جب انسان، انسان کی آنکھوں میں محبت اور عزت تلاش کرتا تھا؛ جب رشتوں میں اعتبار کی روشنی تھی اور دلوں میں ایک دوسرے کے لیے درد۔ مگر اب...... یہ سب کچھ ماضی کی کتاب کے چند پیلے اور بوسیدہ اوراق میں بند ہو کر رہ گیا ہے۔ اب کے زمانے میں زندگی ایک الجھن بن گئی ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو یوں دیکھتے ہیں جیسے سب کسی خفیہ ایجنسی کے رکن ہوں۔ ہر بات، ہر رویہ، ہر تعلق...... سب شک کی بنیاد پر ٹکے ہیں۔ میں نے سوچا کہ ان مشتبہ نظروں کے پیچھے آخر راز کیا ہے؟ کیا زمانہ بدل گیا ہے، یا انسان؟ یہ جاننے کے لیے میں نے خود کو تماشائی بنالیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ لوگوں کو ان کی روزمرہ زندگی میں دیکھوں گا، محسوس کروں گا، اور ان کے چہروں کے اتار چڑھاؤ سے جانچوں گا کہ وہ ایک دوسرے کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ پہلے سوچا کسی راشن اسٹور پر بیٹھ جاؤں، مگر وہاں لوگ کم آتے تھے۔ پھر نائی کی دکان ذہن میں آئی، مگر وہاں صرف مرد آتے تھے۔ لوہار کی دکان پر بیٹھوں وہاں مخصوص طبقہ یعنی کسان آتے ہیں۔ سُنار کی دکان پر بیٹھوں تو وہاں زیادہ تر عورتیں ہی آتی ہیں...... بالآخر تین مہینے سوچنے کے بعد مجھے مناسب جگہ مل گئی...... شاپنگ مال...... شاپنگ مال...... وہ جدید مندر جہاں انسان خریدنے، دیکھنے، تولنے، اور ایک دوسرے کو پرکھنے آتے ہیں۔ میں

روز وہاں بیٹھنے لگا۔ شروع میں سب کچھ معمول کے مطابق لگا، مگر رفتہ رفتہ میں نے ہر آنے جانے والے کو شک کی نگاہ سے دیکھنا شروع کیا۔۔۔کیا سب چور ہیں؟ کیا میں ہی واحد ایماندار انسان ہوں؟ ایک دن ایک وجیہہ، دبنگ شخص آیا۔ صاف ستھرا، پُر رعب، مگر چہرے سے نرم مزاج۔

خریداری کے بعد اس نے نہ صرف بل بھرا بلکہ مجھے ایک ٹپ بھی دے دی۔ میں نے پوچھا: ''آپ یہ قیمت کیوں بار بار دیکھ رہے ہیں؟'' وہ مسکرا کر بولا: ''میری بیوی اسی مال سے سامان خرید کر لے آتی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ جتنا روپے لے جاتی ہے، کیا اتنا سامان لاتی بھی ہے؟ بیٹا، یہ سب اپنے عیال کے لیے کرنا پڑتا ہے۔'' تو وہ یہ کہہ کر گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ میں دیر تک اس کی گاڑی کو دیکھتا رہا۔ دل میں شک کا بیج پھوٹ پڑا...... کیا یہ اپنی بیوی پر شک کر رہا ہے؟ کیا ان کے رشتے میں بھی بدگمانی ہے؟ اسی سوچ میں تھا کہ ایک حسین عورت وہی بل ہاتھ میں لیے شاپنگ مال میں داخل ہوئی۔ وہ ہر اُس جگہ جا رہی تھی جہاں وہ مرد گیا تھا۔ میں نے غور کیا...... وہ چیزوں کو گن گن کر لکھ رہی تھی۔ میں قریب گیا اور پوچھا: ''محترمہ، کیا ڈھونڈ رہی ہیں؟ میں مدد کر دوں؟'' وہ چونکی، مگر مجھے دیکھ کر مسکرا دی۔ ''کچھ نہیں بیٹا، بس یوں ہی دیکھ رہی ہوں......'' پھر ہچکچاتے ہوئے بولی: ''بیٹا، عورتوں کے انڈر گارمنٹس کس طرف ہیں؟'' میں نے راستہ دکھایا۔ وہ وہاں گئی، گنتی کی، کچھ نوٹ کیا، پھر چہرے پر ایک عجیب سی روشنی ابھری...... جیسے کسی شک کی تصدیق ہو گئی ہو یا شاید دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہو۔ میں نے ہمت کی اور پوچھا: ''آپ نے کچھ خریدا نہیں، تو یہ بل آپ کے ہاتھ میں؟'' وہ بولی: ''بیٹا، یہ بل میرے شوہر کا ہے۔ کچھ دیر پہلے انہوں نے یہی سامان خریدا تھا۔ مجھے شک ہوا کہ شاید انہوں نے کچھ اور بھی لیا ہو۔ میں دیکھنے آئی کہ کہیں وہ مجھے دھوکہ تو نہیں دے رہے ہیں......''

میں ساکت رہ گیا۔اب بیوی شوہر پر شک کر رہی تھی۔اور کچھ لمحوں بعد ایک بوڑھا شخص آیا، جس کے چہرے پر زمانے کا نقش تھا۔ ''بیٹا، اس عورت نے کیا خریدا؟''

میں نے کہا: ''کچھ نہیں۔''

وہ بولا: ''یہ میری بہو ہے۔میرے پوتے پوتی نے کہا کہ اس کا تعاقب کرو...... کہیں یہ خریدا ہوا سامان کسی اور کو نہ دے دے......''

میں اُس بوڑھے کو حیرت سے دیکھنے لگا۔اس نے لمبی سانس لی اور بولا: ''بیٹا، یہ زمانہ مشتبہ ہو گیا ہے۔باپ کو بیٹے پر شک ہے، بیوی کو شوہر پر، ماں کو بیٹی پر۔پرانے وقتوں میں ایسا نہیں ہوتا تھا، اس لیے زندگی آسان تھی، دل مطمئن تھے، رشتے مضبوط تھے۔اب ہر کوئی ایک دوسرے کو مشتبہ نظروں سے دیکھتا ہے۔'' وہ یہ کہہ کر چلا گیا۔

میں دیر تک اس کی باتوں میں گم رہا۔یوں لگا کہ مجھے اپنے سوالوں کے سارے جواب مل گئے۔

اور تب میں نے اپنی آنے والی کتاب کا عنوان طے کیا...... ''مشتبہ''

☆☆

دھند

گاؤں کے اوپر صبح کی روشنی نے جیسے سنہری چادر تان رکھی تھی۔ دھند کی ہلکی سی پرت دھان کے کھیتوں پر اُتری ہوئی تھی، سورج کی کرنیں اس پر پڑتیں تو وہ چمکنے لگتی، جیسے قدرت نے زمین پر موتی بکھیر دیے ہوں۔

بھیم راؤ اپنے کھیت میں جھکے ہوئے، درانتی سے دھان کی فصل کاٹ رہے تھے۔ چہرے پر محنت کا پسینہ تھا اور دل میں شکر گزاری۔ اس سال کی فصل بہت اچھی تھی۔ خدا کی مہربانی سے زمین نے سونا اگلا تھا۔

''بابا...... بابا...... چائے لے آئی ہوں!'' بیٹی کی مترنم آواز میں خلوص کا ایسا رس تھا، جو تھکے ہوئے وجود کو پھر سے جوان کر دیتا ہے۔

شکنتلا چائے کی پیالی تھامے کھڑی تھی۔ نرم دھوپ میں اس کا چہرہ جیسے کسی مقدس کتاب کا روشن صفحہ ہو۔ بھیم راؤ نے درانتی زمین میں گاڑ دی اور ندی کی طرف چل دیے۔ ہاتھ منہ دھو کر واپس آئے تو بیٹی کے قریب آ کر مسکرا کر بولے،

''شکنتلا، بھگوان کی کرپا سے فصل خوب ہوئی ہے۔ اور اس سال تو...... تمہاری شادی بھی ہے نا؟''

شکنتلا نے شرماتے ہوئے نظریں چرائیں،

''بابا! آپ تو جیسے مجھے گھر سے نکالنے پر تُلے ہیں!''

بھیم راو نے محبت سے اس کی پیشانی کو چھوا،

''نہیں بیٹا، ایسا نہ کہو۔ تم تو میرے جگر کا ٹکڑا ہو۔ شادی تو فطرت کا تقاضا ہے۔ سکھ رام بار بار کہہ رہا ہے کہ اب شکنتلا کو دلہن بنا ہی دو۔ میں بھی چاہتا ہوں، اپنی زندگی میں تمہیں دلہن بنتے دیکھوں۔''

سکھ رام گاؤں کا وہی امیر کسان تھا، جس نے شکنتلا کو اپنے بیٹے کے لیے مانگ رکھا تھا۔ دو برس ہو چکے تھے منگنی کو، اب صرف وداعی کی رسم باقی تھی۔

شکنتلا نے پیار سے باپ کو دیکھا،

''بابا، میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی۔ تمہاری خدمت کون کرے گا میرے بعد؟''

بھیم راو نے درخت سے ٹیک لگالی، چائے کی پیالی تھام لی۔ شکنتلا پھر سے کہنے لگی،

''میں نے کہا تھا کچھ مزدور بلا لیجیے، آپ اکیلے اتنا کام نہیں کر سکتے۔''

''ڈھونڈا بیٹا، پر کوئی نہیں ملا۔ حاجی شوکت کے کھیتوں میں بہار کے مزدور کام کر رہے ہیں، وہ دو دن میں بھیج دیں گے۔ سوچا، تب تک خود ہی کیوں نہ کر لوں؟ تم بالکل اپنی ماں شیبا جیسی ہوگئی ہو...... وہ بھی ہمیشہ منع کرتی تھیں مجھے کام کرنے سے۔''

شیبا...... وہ نیک بیوی، پیاری ماں، کئی برس پہلے دل کا دورہ پڑنے سے چل بسی تھی۔ بھیم راو اس کے جانے کے بعد اندر سے کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ بیٹا رام کرشن ولایت جا بسا، وہیں شادی کر لی اور پلٹ کر خبر تک نہ لی۔ بس ایک بیٹی تھی، شکنتلا، جس نے ماں بن کر باپ کو سنبھالا۔

چائے کی پیالی بھیم راو کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے شکنتلا کھیت کے دوسرے کنارے چل دی۔ وہ دھان کی بالیوں کو چوم رہی تھی جیسے اپنے بچوں کو پیار کر رہی ہو۔

بھیم راو چائے پیتے پیتے خیالات کی دنیا میں کھو گئے۔ آنکھیں بند کیں تو جیسے شیبا سامنے آ بیٹھی ہو......

''شیبا، دیکھتی ہو؟ ہماری بٹیا کتنی بڑی ہو گئی ہے۔ اس کی شادی کے لیے جو جھمکا لایا ہوں، دیکھا تم نے؟''

شیبا نے شوخی سے کہا، ''جھمکا مہنگا ہو گا نا؟

''ارے پگلی! ہماری ایک ہی بیٹی ہے، اگر اس کے لیے نہ لاؤں تو دولت کا کیا فائدہ!''

''اور جو سرخ لہنگا لائے ہو، اسے پہلے خود پہنا کر دیکھ لینا...... کہ لمبا تو نہیں ہے؟''

''میں کیوں پہناؤں گی؟ خود پہنا کے دیکھو......ویسے میرے لیے کب لائے تھے ایسے کپڑے؟'' شیبا نے شکایت کی۔

''جب تم دلہن بنی تھیں تب لایا تھا نا۔''

''ہوں...... مجھے تو پھٹے پرانے کپڑے ہی ملے تھے، دیکھو یہ سوراخ''......

شیبا نے پیرہن کا کونا دکھایا۔ پھر روٹھ کر جانے لگی، ''میں نہیں بولتی تم سے!''

''شیبا!'' بھیم راو نے پکارا۔

آنکھ کھلی تو چائے کا پیالہ ہاتھ سے گر چکا تھا۔ خیالوں کی دھند چھٹ چکی تھی۔ شکنتلا دوڑتی آئی،

''بابا! آپ نے کس کو پکارا؟ چائے کیوں گر گئی؟''

بھیم راو نے نظر چرائی، ''کچھ نہیں بیٹا''......

شکنتلا نے نیا پیالہ دیا اور کہا،

''آپ کا دھیان کہیں اور رہتا ہے، خود کا خیال نہیں رکھتے۔''

اسی دن شام کو دونوں باپ بیٹی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے، ہنستے رہے، خواب بنتے رہے۔ اور پھر نیند کی آغوش میں کھو گئے۔

صبح سورج چمک رہا تھا۔ چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ شکنتلا اٹھی، ناشتہ تیار کیا اور باپ کے

کمرے میں چلی گئی۔

''بابا...... بابا...... اٹھئے نا!''

کوئی جواب نہ آیا۔

وہ قریب گئی، چادر ہٹائی تو دل لرز گیا۔ جسم ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ سانسیں تھم چکی تھیں۔

''نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا!''

اس کی چیخ نے خاموش گاؤں کو ہلا دیا۔

لوگ جمع ہوئے۔ جنازہ اُٹھا۔ بھیم راو کا انتم سنسکار ہوا۔ شکنتلا بے حس، ساکت بیٹھی رہی۔

کچھ دن بعد، رسموں کے تحت، سکھ رام نے شکنتلا کی شادی اپنے بیٹے سے کر دی۔ مگر یہ شادی شادی نہ تھی، زخم تھا۔ سسرال والوں نے دل میں جگہ نہ دی۔ وہ شکنتلا جو باپ کے لیے جیتی تھی، اب اپنے ہی سسرال میں پرایا احساس لے کر جینے پر مجبور تھی۔

دن بیتے۔ ایک دن گاؤں میں خبر پھیلی،

''سکھ رام کی بہو گھر سے بھاگ گئی ہے!''

کچھ ہی دیر میں وہ ملی۔ سیب کے باغ میں، ایک درخت سے لٹکی ہوئی۔ اس کی معصوم جان، دنیا کے ظلم سے ہار گئی تھی۔

تب سے کہتے ہیں، شکنتلا کی آتما سکھ رام کے گھر والوں کو چین سے سونے نہیں دیتی۔ ہر رات جیسے دھند اس گھر پر چھا جاتی ہے۔ کوئی دروازے پر دستک دیتا ہے، کوئی نام لے کر پکارا جاتا ہے، اور ہر صبح...... ہر صبح گھر کے آنگن میں، ایک ٹھنڈی چائے کی پیالی پڑی ہوتی ہے......

☆☆

قرضہ

’’کبھی کبھی انسان اپنی پوری زندگی کی نیکیوں کے بعد بھی زمانے کے قرض سے آزاد نہیں ہو پاتا، اور وہ قرض اکثر روپے کا نہیں بلکہ نظام کا ہوتا ہے۔‘‘ سماج میں روز بہ روز ایسی بہت سی چیزیں جنم لے رہی ہیں جو انسان کی زندگی پر براہِ راست اثر ڈالتی ہیں۔ کبھی مہنگائی، کبھی بے روزگاری، اور کبھی وہ پالیسیاں جو انسان کی محنت کا صلہ بھی اس سے چھین لیتی ہیں۔ انہی تلخ حقیقتوں کے بیچ عبدالقیوم نام کا ایک انسان جیتا تھا...... جب میں بچپن میں تھا، تب عبدالقیوم کالج جایا کرتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں وہ پہلا شخص تھا جس نے میٹرک پاس کیا تھا۔ گاؤں کے لوگ اُس پر فخر کرتے تھے، جیسے وہ صرف اپنا نہیں، سب کا بیٹا ہو۔ جب اس نے گریجویشن مکمل کی، تو پورے گاؤں میں جیسے عید منائی گئی۔ شادیانے بجے، اور ایسی ضیافت ہوئی کہ لوگ آج تک یاد کرتے ہیں۔ چند ہی دن بعد حکومت کی طرف سے اُس کے لیے استاد کی تقرری کا حکم نامہ آیا۔ گاؤں کے اسکول میں وہ پہلا سرکاری ملازم تھا۔ تب گاؤں کے بچوں نے تعلیم کی طرف قدم بڑھایا، اور میں نے بھی انہی کے زیرِ سایہ پڑھنا شروع کیا۔ عبدالقیوم محض استاد نہیں تھا..... وہ ایک مشن تھا، ایک جذبہ، ایک خواب۔ وہ اپنی تنخواہ سے بچوں کے لیے کتابیں، کاپیاں، پنسلیں اور بعض اوقات وردی تک خرید کر لاتا۔

میں نے ایک دن پوچھا:

''سر! آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟''

وہ مسکرا کر بولا: ''مجھے سکون ملتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے گاؤں میں ہر بچہ پڑھ لکھ کر سرکاری نوکری کرے۔''

عبدالقیوم نے ایک نیک دل اور سمجھ دار عورت سے شادی کی۔

دونوں نہایت سادہ، دیالو اور مخلص انسان تھے۔ چار بچے ہوئے...... ایک بیٹی اور تین بیٹے۔ سبھی پڑھ لکھ گئے، مگر قسمت نے سرکاری نوکری نہیں لکھی تھی۔ کئی سال کی کوششوں کے بعد جب کچھ نہ بن سکا تو عبدالقیوم نے سوچا کہ کوئی چھوٹا سا کاروبار شروع کرے۔ مگر کاروبار کے لیے سرمایہ کہاں سے آتا؟

اسی دوران حکومت نے نئی پنشن اسکیم (NPS) نافذ کی...... جس نے ہزاروں ملازمین کے بڑھاپے کا سہارا چھین لیا۔ اب نئے ملازمین کو وہ پرانی مستقل پنشن نہیں ملنی تھی۔ جو رقم تنخواہ سے کاٹی جاتی، وہ ریٹائرمنٹ کے بعد معمولی قسطوں میں واپس دی جاتی۔ عبدالقیوم جیسے دیانتدار ملازمین کے لیے یہ فیصلہ گویا بجلی کا جھٹکا تھا۔

اس نے اپنی ساری زندگی ایمانداری سے گزاری، مگر بڑھاپا غربت اور قرض میں ڈوب گیا۔ بیٹی کی شادی قرض لے کر کی۔ بیٹے ناراض رہنے لگے۔ گھر کے خرچے بہ مشکل پورے ہوتے۔ اور پھر ایک دن وہ ریٹائر ہوا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اس کی ماہانہ رقم صرف پانچ سو روپے تھی...... پانچ سو روپے! جن میں صرف شگر کی دوا کی ایک پتی آتی تھی۔ باقی دوائیں اور ضرورتیں ہمیشہ قرض پر ہی آتیں۔ پھر ایک دن خبر آئی۔ ''عبدالقیوم نے خودکشی کرلی''...... لوگ دوڑے آئے۔ جنازے کی تیاری ہو رہی تھی کہ مولوی صاحب نے اس کی جیب سے ایک پرچی نکالی۔ پرچی پر لکھا تھا ''یہ سن کر تم سب حیران ہوں گے کہ میں نے خودکشی کیوں کی؟

مجھے حکومت کی طرف سے میرے ہی پیسوں میں سے صرف پانچ سو روپے ملتے تھے۔ میں بالکل اُس شخص کی طرح ہوں جو دوسروں کو پانی پلاتا ہے مگر خود پیاسا رہ جاتا ہے۔ اب میں اپنے بچوں پر بوجھ بن گیا ہوں۔ نئی پنشن اسکیم ظلم ہے...... انسان جب تک زندہ ہے، اُس سے کام لیا جاتا ہے، اور جب وہ بوڑھا ہو جاتا ہے تو دھکے دے کر نکال دیا جاتا ہے۔ میرے بچوں سے گزارش ہے کہ میرا قرضہ اتاریں، کیونکہ میں انہیں کچھ نہیں دے سکا...... صرف قرض ہی قرض۔

باقی والسلام۔

آج بھی ہمارے معاشرے میں بے شمار عبدالقیوم زندہ ہیں.....

وہ استاد، وہ ملازم، وہ دیانتدار لوگ جو ساری زندگی دوسروں کو سنوارتے ہیں، مگر بڑھاپے میں دوائی کی ایک گولی کو ترس جاتے ہیں۔ عبدالقیوم تو چلا گیا، مگر اُس کا قرض آج بھی ہمارے سماج پر باقی ہے۔

☆☆

چنار کا پیڑ

عبدالجبار جنگلوں سے لکڑیاں چُرا کر شہر میں فروخت کرتا اور اسی سے اپنا پیٹ پالتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ درخت بیکار ہوتے ہیں...... نہ پھل دیتے ہیں، نہ پھول...... اس لئے انہیں کاٹ دینا ہی بہتر ہے۔

ہر روز وہ جنگل سے گزرتا اور تھک کر ایک چنار کے پیڑ کے نیچے آرام کرتا، پھر تازہ دم ہو کر واپس لکڑیاں کاٹنے چل پڑتا۔ وقت گزرتا گیا، جبار بھی بوڑھا ہونے لگا اور وہ چنار بھی۔ نہ جبار نے شادی کی اور نہ چنار کے تنے سے کوئی نئی شاخ پھوٹی۔ دونوں اکیلے تھے، اس تنہائی نے انہیں دوست بنا دیا۔ وہ ایک دوسرے سے دل کی باتیں کرتے اور اپنے دکھ درد بانٹتے۔

ایک دن چنار نے پوچھا:

''جبار! تم درخت کیوں کاٹتے ہو؟ کیا تم یہ نہیں جانتے کہ درختوں کی بھی جان ہوتی ہے، تمہاری طرح؟''

جبار نے آہ بھری:

''اپنا پیٹ پالنے کے لیے کچھ بھی کرنا پڑتا ہے۔ میں وہ درخت کاٹتا ہوں جو میرے کام کے نہیں۔''

چنار نے کہا:

''اللہ کی بنائی ہوئی کوئی چیز بیکار نہیں ہوتی۔ وقت آئے گا تو تمہیں خود پتہ چل جائے گا۔''

وقت گزرا، جبار بوڑھا کمزور اور بیمار ہو گیا۔ جنگل جانا مشکل ہو گیا اور کھانے کو کچھ نہ تھا۔ ایک دن وہ کلہاڑی اور آرہ لے کر چنار کے پاس آیا۔

چنار نے حیران ہو کر پوچھا:

''آج تمہارے ہاتھوں میں یہ اوزار کیوں؟''

جبار نے روتے ہوئے کہا:

''میں ضعیف ہو چکا ہوں۔ سانس آکسیجن مشین سے چلتی ہے، خریدنے کے لئے پیسے نہیں۔ کئی دنوں سے بھوکا ہوں۔ سوچا تمہیں کاٹ کر بیچ دوں...... آخر دوست مصیبت میں کام آئے تو ہی دوست کہلاتا ہے۔''

چنار نے گہری سانس لی اور کہا:

''جبار! یہ آکسیجن جو تم خریدتے ہو، میں تمہیں ساری عمر مفت دیتا رہا ہوں۔ آج بھی تم یہاں بیٹھے ہو تو میری ہی سانسوں کا سہارا ہے۔ مجھے مت کاٹو''......

جبار بضد رہا:

''بھوک بڑی ظالم ہے، میں مجبور ہوں۔''

چنار نے پیار سے کہا:

''قریب آؤ، میری گود میں اگی یہ مشروم لے جاؤ، پکا کر کھاؤ اور اپنی بھوک مٹالو۔''

جبار نے مشروم لے جا کر پکائے اور خوب پیٹ بھرا۔

پھر ایک دن شدید طوفان آیا اور پوری وادی کی جھونپڑیاں اکھڑ گئیں۔ سب نے اپنی اپنی جھونپڑیاں دوبارہ بنالیں مگر جبار بے گھر رہ گیا — نہ لکڑی تھی نہ پیسہ نہ طاقت۔

وہ بھٹکتا بھٹکتا پھر اسی چنار کے سائے میں آ بیٹھا۔

چنار نے رنج سے پوچھا:

''کیا ہوا دوست؟ اتنے شکستہ کیوں ہو؟''

جبار نے رو کر کہا:

''میری جھونپڑی طوفان میں اڑ گئی۔ سمجھ نہیں آتا کہاں جاؤں۔''

چنار نے اپنے کھوکھلے ہوئے تنے کی طرف اشارہ کیا اور کہا:

''آؤ، میری گود میں رہ جاؤ۔ اپنی باقی زندگی یہیں گزار دو، تاکہ مجھے بھی لگے کہ میں کسی کے کام آیا۔''

اس لمحے جبار کی آنکھیں کھل گئیں۔

وہ فضا کی طرف دیکھ کر بولا:

''سچ کہتے تھے تم — دنیا میں اللہ کی بنائی کوئی چیز بیکار نہیں!''

پھر وہ وہیں چنار کے تنے میں رہ کر عبادتِ الٰہی کرتا رہا اور اسی جگہ اس کا انتقال ہوا۔

چنار کے نیچے جبار کی قبر بنی..... لوگ وہاں فاتحہ کے لیے آنے لگے اور اس کی قبر پر ہمیشہ رش لگا رہتا۔

☆☆

زخم جو بولتے ہیں

شہر کی شور بھری گلیوں سے دور، بستی کے کنارے ایک پرانا سا پل پڑا تھا۔ وہ پُل، جو کبھی انسانوں کے قدموں سے زندہ رہتا تھا، اب زنگ کے بوجھ تلے کراہتا تھا۔ اس پر وقت نے اپنے ناخن ایسے گاڑ دیے تھے کہ اس کی دراڑوں سے چیخیں سنائی دیتی تھیں۔ اس کے نیچے کبھی موجیں گاتی ندی بہتی تھی، مگر اب وہ ندی ایک مردہ بدن کی مانند پڑی تھی...... اس کی خشک رگوں میں پانی کے بجائے خاموشی بہتی تھی۔ ایسی خاموشی، جو صرف سننے والوں کے دل پھاڑ ڈالتی ہے۔

لوگ کہتے تھے کہ رات کے پچھلے پہر جب سب سو جاتے ہیں تو اس پل سے رونے کی آوازیں آتی ہیں۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ آواز کس کی ہے.... پتھروں کی؟ وقت کی؟ یا انسان کی شکست کی؟

اسی پُل کے سائے تلے ایک بوڑھا شخص روز آ کر بیٹھ جاتا تھا..... عبداللہ۔ وہ ایک بدن تھا مگر اس کے اندر شکستہ تاریخ کی عظیم خاموشی بسی ہوئی تھی۔ کبھی اس کی آواز بجلی کی گرج جیسی گونجتی تھی، ہاتھ فولاد کی طرح مضبوط تھے، اور نگاہ میں روشنی کی تیز لہریں تھیں۔ مگر اب وقت نے اسے ایسے پیوند لگا دیے تھے کہ وہ چلتا تو سایہ بھی اس سے آگے نکل جاتا۔ اس کی پشت جھکی ہوئی تھی، جیسے زندگی کے بوجھ تلے زمین اس کے کاندھوں تک جھک آئی ہو۔ وہ روز زمین پر انگلیوں سے کچھ لکھتا، پھر مٹا دیتا۔ لکھتا..... مٹاتا..... لکھتا۔

جیسے امید اور مایوسی کی جنگ ہو اور دونوں تھکن سے چور ہو کر ایک دوسرے کو پیچھے چھوڑنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

ایک دن اسکول کے چند بچے وہاں سے گزرے۔ ان میں احتشام نام کا لڑکا سب سے آگے تھا۔ اس نے بوڑھے کو دیکھا.... ٹوٹا ہوا مگر باوقار، خاموش مگر بولتا ہوا۔

احتشام آگے بڑھا اور دھیرے سے پوچھا "بابا جی...... آپ کیا لکھتے رہتے ہیں؟"

عبداللہ نے انگلی سے زمین پر لکھے لفظ پر ہاتھ پھیرا۔

اس کی آنکھوں میں ہزاروں راتوں کا بوجھ تھا۔ آسمان کی طرف دیکھ کر بولا "میں زخم لکھتا ہوں، بیٹا...... وہ زخم جو بولتے ہیں...... مگر کوئی سنتا نہیں۔"

بچے حیرت میں ڈوب گئے...... احتشام نے سوال کیا "زخم بھی بولتے ہیں؟"

بوڑھا مسکرایا۔ وہ مسکراہٹ روشنی کی وہ آخری کرن تھی جو غروبِ آفتاب سے پہلے باقی رہ جاتی ہے۔

"ہاں بیٹا، زخم بولتے ہیں۔ جسم کے زخم وقت بھر دیتا ہے۔

مگر دل کے زخم...... وہ وقت گنتے گنتے خود وقت کو زخمی کر دیتے ہیں۔ وہ چیختے ہیں، فریاد کرتے ہیں...... لیکن دنیا صرف ہنسی اور جشن سننا چاہتی ہے۔ رونے والی آواز اسے گناہ لگتی ہے۔"

احتشام نے پھر پوچھا "آپ کے زخم کیوں لگے؟

عبداللہ کے ہاتھ لرز گئے۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھا "یہاں جو زخم ہیں، یہ کسی چھری سے نہیں لگے۔ یہ بیوفائی، بھول جانے اور اکیلے چھوڑ دینے کے زخم ہیں۔

میں نے ساری عمر دینے میں گزار دی.... اور جب ہاتھ خالی ہو گیا تو سب نے منہ موڑ لیا۔

"بیٹا...... لوگ محبت سے نہیں، ضرورت سے ساتھ رہتے ہیں۔

جب ضرورت ختم ہو جائے تو انسان کاغذ کی طرح پھینک دیا جاتا ہے۔انسان کی اصل قبر دل میں بنتی ہے، مٹی میں نہیں۔''

ہوا رک گئی۔جیسے کائنات بھی سن رہی ہو۔احتشام نے دھیرے سے کہا''بابا جی،لوگ اتنے بے رحم کیوں ہوتے ہیں؟''

بوڑھا ہنسا......وہ ہنسی جو رونے سے بھی زیادہ تکلیف دیتی ہے۔

''کیونکہ لوگ دل سے نہیں دیکھتے......آنکھوں سے دیکھتے ہیں......کپڑا، گاڑی، دولت، طاقت۔

اندر کی ٹوٹی دنیا کوئی نہیں دیکھتا۔دل کے قبرستان میں کوئی نہیں اترتا۔''وہ زمین پر لکھنے لگا''انسان کا اصل قد تب معلوم ہوتا ہے جب وہ دوسروں کے سہارے کا محتاج ہو جائے۔''

اور پھر بولا''زندگی کہتی ہے اصل انسان وہ ہے جو اس وقت ساتھ کھڑا رہے جب تمہارے پاس دینے کو کچھ بھی نہ بچے۔''

احتشام کی آنکھیں بھر آئیں''بابا جی......کیا کبھی آپ کے زخم بھر جائیں گے؟''

بوڑھے نے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھایا''زخم تب بھر جاتے ہیں بیٹا......جب کوئی انہیں سن لے۔

کیونکہ درد بھی عبادت ہے......

اور عبادت بغیر سننے والے کے ادھوری رہتی ہے۔''

اسی وقت مغرب کی اذان گونج اٹھی۔آسمان لہو رنگ تھا، سورج ڈوب رہا تھا، مگر کہیں دور روشنی پھوٹ رہی تھی......جیسے امید مر کر دوبارہ زندہ ہوئی ہو۔

بوڑھے نے آخری جملہ لکھا''دنیا کا سب سے بڑا جرم، کسی کو وقت پر سہارا نہ دینا ہے۔اور سب سے بڑا ثواب، کسی ٹوٹے دل کو تھام لینا ہے۔''

بچے اٹھ کھڑے ہوئے۔احتشام نے بوڑھے کا ہاتھ چوما''ہم وعدہ کرتے ہیں بابا جی......کہ ہم کسی کو تنہا نہیں چھوڑیں گے۔ہم زخموں کو خاموش نہیں رہنے دیں گے۔''اور برسوں سے سوکھی ندی کے سینے میں ہلکی سی ارتعاش دوڑ گئی......

جیسے پانی لوٹنے کے لئے چل پڑا ہو۔

اوراس رات وہ زخم جو بولتے تھے......بالآخر خاموش ہو گئے۔

☆☆

ادھورے سپنے

لعل الدین میرے گاؤں کا ایک نہایت ہی شریف، ایماندار اور محنتی آدمی تھا۔
اس کے دل میں ایمانداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ پیشے سے مزدور تھا اور جہاں بھی مزدوری کرنے جاتا تھا، اپنا کام پوری دیانتداری اور محبت سے انجام دیتا تھا۔
اس کے تین بچے تھے...... ایک بیٹا شوکت اور دو بیٹیاں۔ حمیرا اور سویٹی۔
لعل الدین کا سب سے بڑا خواب یہ تھا کہ وہ اپنے بیٹے شوکت کو ڈاکٹر بنائے۔ اسی لئے دن میں مزدوری اور رات میں فیکٹری میں چوکیداری کا کام کرتا تھا۔
لعل الدین مجھے بلّو کہہ کر پکارتا تھا۔ روز صبح جب وہ مزدوری کے لیے نکلتا تو مجھ سے ضرور ملتا۔ جب تک میں اسے نہیں دیکھ لیتا تھا، مجھے بھی سکون نہیں ملتا تھا۔ اسی لئے میں روز صبح گھر کے دروازے پر اس کا انتظار کرتا تھا۔
اتوار کا دن تھا۔ لعل الدین کو دیکھے تین روز گزر چکے تھے۔ اسکول میں چھٹی تھی، تو میں اس کے گھر گیا کہ اس کی خیریت معلوم کروں۔ اندر داخل ہوا تو وہ ایک پرانی پھٹی ہوئی چارپائی پر کراہ رہا تھا اور بار بار کھانسی کے شدید دورے پڑ رہے تھے۔
میں نے سلام کیا، مگر وہ جواب دینے میں بھی کامیاب نہ ہو سکا۔
اس کا بیٹا شوکت سرہانے بیٹھا تھا، جبکہ ایک طرف حمیرا اور سویٹی اپنے اسکول کا کام کر رہی تھیں اور معصومیت سے ایک دوسرے سے جھگڑ رہی تھیں۔

بچے اٹھ کھڑے ہوئے۔احتشام نے بوڑھے کا ہاتھ چوما''ہم وعدہ کرتے ہیں بابا جی......کہ ہم کسی کو تنہا نہیں چھوڑیں گے۔ہم زخموں کو خاموش نہیں رہنے دیں گے۔''اور برسوں سے سوکھی ندی کے سینے میں ہلکی سی ارتعاش دوڑ گئی......

جیسے پانی لوٹنے کے لئے چل پڑا ہو۔

اور اس رات وہ زخم جو بولتے تھے......بالآخر خاموش ہو گئے۔

☆☆

ادھورے سپنے

لعل الدین میرے گاؤں کا ایک نہایت ہی شریف، ایماندار اور محنتی آدمی تھا۔
اس کے دل میں ایمانداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ پیشے سے مزدور تھا اور جہاں بھی مزدوری کرنے جاتا تھا، اپنا کام پوری دیانتداری اور محبت سے انجام دیتا تھا۔
اس کے تین بچے تھے......ایک بیٹا شوکت اور دو بیٹیاں۔ حمیرا اور سویٹی۔
لعل الدین کا سب سے بڑا خواب یہ تھا کہ وہ اپنے بیٹے شوکت کو ڈاکٹر بنائے۔ اسی لئے دن میں مزدوری اور رات میں فیکٹری میں چوکیداری کا کام کرتا تھا۔
لعل الدین مجھے بلّو کہہ کر پکارتا تھا۔ روز صبح جب وہ مزدوری کے لیے نکلتا تو مجھ سے ضرور ملتا۔ جب تک میں اسے نہیں دیکھ لیتا تھا، مجھے بھی سکون نہیں ملتا تھا۔ اسی لئے میں روز صبح گھر کے دروازے پر اس کا انتظار کرتا تھا۔
اتوار کا دن تھا۔ لعل الدین کو دیکھے تین روز گزر چکے تھے۔ اسکول میں چھٹی تھی، تو میں اس کے گھر گیا کہ اس کی خیریت معلوم کروں۔ اندر داخل ہوا تو وہ ایک پرانی پھٹی ہوئی چارپائی پر کراہ رہا تھا اور بار بار کھانسی کے شدید دورے پڑ رہے تھے۔
میں نے سلام کیا، مگر وہ جواب دینے میں بھی کامیاب نہ ہوسکا۔
اس کا بیٹا شوکت سرہانے بیٹھا تھا، جبکہ ایک طرف حمیرا اور سویٹی اپنے اسکول کا کام کر رہی تھیں اور معصومیت سے ایک دوسرے سے جھگڑ رہی تھیں۔

میں نے پوچھا:

''لعل چاچا، خیر تو ہے؟''

بڑی مشکل سے اس نے گلے کو صاف کیا اور دھیمی آواز میں کہا:

''بیٹا...... تین روز سے تیز بخار ہے۔ کھانسی بھی بند نہیں ہوتی...... دوائی بھی کھائی، مگر آرام نہیں ملا......''

میں نے پوچھا:

''دوائی کہاں سے لائی؟''

شوکت نے جواب دیا:

''ڈاکٹر بنسل کے پاس سے۔''

ڈاکٹر بنسل دراصل گاؤں کا ایک عمر رسیدہ کمپاؤنڈر تھا، مگر لوگ اسے ڈاکٹر کہتے تھے اور وہ چند ایک عام گولیوں سے ہر بیماری علاج کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ میں نے شوکت سے کہا کہ ہم اسے پاس والے گاؤں کے مشہور ڈاکٹر کے پاس لے کر جائیں گے۔ بڑی مشکل سے ہم نے لعل الدین کو اٹھایا، مگر اس کے جسم میں ہمت نہ تھی۔ مجبوراً اسے واپس چارپائی پر لٹا دیا اور حمیرا اور سویٹی کو کہا کہ اس کا خیال رکھیں۔ پھر ہم دوڑتے ہوئے ڈاکٹر کے پاس گئے۔

ڈاکٹر فوراً ساتھ چلنے کو تیار ہوا۔ اس نے ایک پرانی ایمبیسڈر گاڑی نکالی، جو شاید اسے وراثت میں ملی تھی، مگر رفتار اچھی تھی۔

گھر پہنچتے ہی ڈاکٹر نے لعل الدین کا معائنہ شروع کیا اور مسلسل سخت ہدایات دیتا رہا:

''منہ کھولو...... زور سے سانس لو...... کھانسو...... کپڑا اٹھاؤ......''

لعل الدین ان سب کوششوں کے باوجود کچھ بھی ڈھنگ سے نہ کرسکا۔ ڈاکٹر نے ایک گہری

آہ بھری اور پوچھا:

''کتنے دن سے بیمار ہیں؟''

شوکت نے کہا: ''تین دن سے۔''

ڈاکٹر نے افسردہ لہجے میں کہا:

''نہیں، کافی وقت ہو چکا ہے......''

اس نے پرچی لکھ کر دوائی نکالی اور کہا:

''اڑھائی ہزار روپے ہوں گے۔''

شوکت باپ کا پرانا کوٹ کیل سے اتارا اور اس کی جیبیں جھاڑی۔

صرف تین سو روپے نکلے۔

شوکت نے کہا:

''ڈاکٹر صاحب، صرف تین سو ہیں۔''

ڈاکٹر نے غصے سے دوائیاں واپس لیں، چند کیپسول میز پر پھینک دیئے اور بڑبڑایا:

''جب پیسے نہیں تھے تو مجھے کیوں بلایا؟''

اور مجھے بیگ پکڑاتے ہوئے گاڑی تک آنے کو کہا۔

گاڑی کے پاس پہنچ کر میں نے ہمت کر کے پوچھا:

''ڈاکٹر صاحب! کیا لعل چاچا ٹھیک ہو جائیں گے؟''

ڈاکٹر نے سخت آواز میں کہا:

''کبھی نہیں۔''

میں لرز گیا:

''کیا مطلب؟''

''اسے آخری اسٹیج کا کینسر ہے۔ دوائی کچھ نہیں کر سکتی......بس چند دنوں کی بات ہے......''

ڈاکٹر صاحب کی باتوں میں نہ کوئی افسوس تھا اور نہ ہی کوئی ہمدردی تھی......کیا سبھی ڈاکٹر ایسے ہی ہوتے ہیں؟ اگر ہاں تو میں شوکت کو کبھی بھی ڈاکٹر بننے نہیں دوں گا کیونکہ میں اسے بگڑتا ہوا نہیں دیکھوں گا کیونکہ وہ میرے دوست کا بچہ ہی نہیں بلکہ میں اسے اپنا سگا بیٹا تصور کرتا تھا......

میرے قدم زمین میں دھنس گئے۔ میں خاموش کھڑا تھا اور ڈاکٹر گاڑی چلا کر چلا گیا۔

میرے کانوں میں لعل الدین کی پرانی بات گونجتی رہی: ''بِلّو! میں اپنے شوکت کو ڈاکٹر بناؤں گا......''

چونکہ لعل الدین گھر کا واحد کمانے والا تھا، اس کے بستر پر پڑ جاتے ہی گھر کی ذمہ داری شوکت کے کندھوں پر آ گئی۔

اس نے پڑھائی چھوڑ دی اور ایک مستری کی دکان پر کام شروع کر دیا۔

دو مہینے بعد رات کو رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ کھڑکی سے باہر دیکھا تو لوگ لعل دین کے گھر کی طرف بھاگ رہے تھے۔

میں بھی لپک کر وہاں پہنچا۔

چارپائی پر لعل الدین کی بے جان لاش پڑی تھی۔

اس کے چہرے پر اب بھی جیسے کوئی سوال لکھا ہوا تھا...

اور شوکت باپ کے سینے سے لپٹ کر رو رہا تھا: ''بابا! آنکھیں کھولو بابا......''

تمہارا خواب ادھورا رہ گیا بابا......

میں ڈاکٹر نہیں بن سکا بابا......

میں خاموش کھڑا آنسو پونچھتا رہا......لعل الدین کے ادھورے سپنے میری آنکھوں کے سامنے بکھرے پڑے تھے۔

☆☆

انتظار

رات کے سناٹے میں خاموشی اس قدر گہری تھی کہ جیسے پورا محلّہ سانس روک کر کھڑا ہو۔ دور کہیں بندوق کی ہلکی سی آواز گونجتی اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ سرد رات کی ہوا دراڑوں سے گھر میں داخل ہو رہی تھی اور بچوں کے کمزور جسم سردی سے کپکپا رہے تھے۔

رحیم چاچا اور ان کی بیوی مختی بیگم کبھی ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھتے اور کبھی گھر کے مرکزی دروازے کی طرف نظریں جما دیتے..... جیسے دروازہ ابھی کھلے گا اور کوئی مسیحا زندگی کی خیرات ہاتھوں میں لیے کھڑا ہوگا۔

لیکن دروازہ تھا کہ پتھر کی طرح ساکت اور بے رحم کھڑا تھا۔

چھوٹے کمرے کے کونے میں دونوں بچے، جو بھوک اور کمزوری کے باعث بے جان سے ہو گئے تھے، سوئے پڑے تھے۔ مختی بیگم جب بھی ان کے پھول جیسے چہروں کو دیکھتی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھم نہ پاتے، جیسے اندر کوئی بند باندھ ٹوٹ چکا ہو اور غم کا سیلاب بہہ نکلا ہو۔

''آج بھی بچے بھوکے سو گئے......''

مختی نے لرزتی آواز میں کہا اور کھانس کر گلے کو صاف کیا۔

رحیم چاچا نے آنکھیں بند کر کے ایک گہری سانس لی، جیسے سینے میں صدیوں کا بوجھ دب گیا ہو۔

''ہاں مختی......آج دوسرا دن ہے۔ کہتے ہیں کل کرفیو میں ڈھیل مل سکتی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو

میں کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔ بس اب برداشت نہیں ہوتا...... بچوں کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔''

مختی بیگم نے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتے ہوئے آہستہ سے کہا،

''مگر کیا کرو گے؟ آپریشن کے بعد سے آپ اتنے کمزور ہو گئے ہیں کہ مزدوری بھی نہیں ملتی۔ دوائی بھی ختم ہوگئی ہے۔ کوئی ہمارا سہارا نہیں، کسی کو ہمارے دکھ سے کیا لینا۔''

رحیم چاچا نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا،'' کچھ رضا کار آئے تھے محلے میں، راشن بھی بانٹا ہے انھوں نے...... مگر نہ جانے کیوں ہمارے گھر کی طرف کوئی نہیں آیا۔ شاید کل پھر آئیں گے...... شاید ہماری باری بھی آجائے۔''

''ہاں...... اللہ کرے......'' مختی نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا اور دونوں خاموش ہو گئے۔

گھر میں جلتی ہوئی مٹی کے چراغ کی مدھم روشنی دیواروں پر ڈول رہی تھی، جیسے امید کی آخری سانسیں باقی ہوں۔

رحیم چاچا نے بچوں کو دیکھا.... چہرے مرجھائے ہوئے، ہونٹ خشک، اور آنکھوں کے گرد نیلاہٹ کی لکیریں کھینچی ہوئی تھیں۔

''یا اللہ، ان معصوموں پر رحم کر......'' انہوں نے آہستہ سے کہا اور دونوں نیند کے بے بس حصار میں ڈوب گئے۔ اگلی صبح کو سورج ابھی پوری طرح نہیں نکلا تھا کہ تیز سائرن اور گاڑیوں کے شور نے محلے کو ہلا دیا۔ پولیس کی گاڑی گلی میں داخل ہوئی اور ایک خوفناک آواز اسپیکر سے گونجی..... ''کرفیو میں کسی قسم کی ڈھیل نہیں دی جائے گی۔ ہر شخص گھر کے اندر رہے۔ خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف سخت کارروائی ہوگی......''

رحیم چاچا نے اداس نظروں سے مختی کی طرف دیکھا۔'' لگتا ہے آج بھی کچھ نہیں ہوگا...... مگر ہم شام تک انتظار کریں گے۔ شاید کوئی مسیحا آج ہی آئے گا۔''

وہ دونوں پورا دن دروازے کے پاس بیٹھے رہے۔ ہر قدم کی آواز پر چونکتے، ہر سائے کو امداد سمجھتے، ہر موڑ کو تکتے رہے۔

مگر غروب آفتاب کے ساتھ امید کی روشنی بھی دھندلانے لگی۔

رات گہری ہوئی۔ ٹھنڈ تیز ہوگئی۔

اور دروازے پر کوئی دستک نہ دی گئی۔ بچے بھوک سے کراہتے رہے۔

پھر تھکن اور کمزوری سے خاموشی میں ڈوب گئے۔

صبح ہوتے ہی محلے کے لوگ ایک دوسرے کے گھروں سے خبریں پوچھ رہے تھے۔ کسی نے کہا راشن بانٹا گیا، کسی نے کہا ایمبولینس بھری واپس گئیں، کسی نے بتایا کہ کئی بچے بھوک اور بیماری سے بے ہوش ہوگئے۔

مگر رحیم چاچا کے دروازے پر آج بھی خاموشی چھائی رہی۔ دن ڈھلنے لگا۔ رات پھر سے اتر آئی۔

رحیم چاچا نے بچوں کی سانسیں چیک کیں، ان کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا، اور آسمان کی طرف دیکھ کر بہ آواز بلند رو پڑے:

''یا اللہ! انتظار کی بھی کوئی حد ہوتی ہے...... کب تک؟ یہ معصوم کب تک اس آزمائش میں جلتے رہیں گے؟''

مختی بیگم سسکیوں میں ڈوب گئی۔

''رحیم...... اب مجھے لگتا ہے کوئی نہیں آئے گا...... ہم بھولے جا چکے ہیں...... ہم اس دنیا کے لیے کبھی تھے ہی نہیں......''

رحیم نے آہستہ سے کہا،

''نہیں مختی...... ایک دن ضرور کوئی آئے گا...... کوئی تو ہوگا جو سنے گا...... کوئی تو ہوگا جوان

بچوں کو بھوکا نہیں سونے دے گا۔'' اور دونوں ہاتھوں میں سر رکھ کر بیٹھ گئے۔

چراغ بجھ گیا۔

کمرہ اندھیرے میں ڈوب گیا۔

اور ان کی آخری امید بھی ٹمٹما کر بجھ گئی۔

اس رات بھی دروازے پر کوئی دستک نہیں ہوئی۔

اور ان کا انتظار پتھر کی طرح جمتا گیا۔

کل شاید کوئی آئے!!!

آج کوئی نہیں آیا۔

اور انہیں آج بھی انتظار ہے......

☆☆

اولڈ ایج ہوم

دن چڑھنے سے پہلے کی نیلگوں روشنی میں مجید اکثر خواب دیکھا کرتا تھا......

ایک ایسا خواب جس میں ایک بچہ اس کے کندھوں پر بیٹھ کر آسمان کی طرف انگلی اٹھاتا اور کہتا:

''بابا! ایک دن میں ستاروں کو چھولوں گا!''

مجید ایک معمولی دکان کا چپراسی تھا، مگر اس کی پیشانی پر خودداری کی روشنی اور آنکھوں میں انسان ہونے کا غرور تھا۔ سعدیہ اس کے زخموں پر مرہم تھی...... سچ، سادہ، مگر محبت کی خوشبو سے بھری ہوئی۔ دونوں کی زندگی میں کوئی دولت نہیں تھی...... مگر امید کا چراغ ہر رات جلتا تھا۔

شادی کو ایک سال ہوا تھا جب سعدیہ دردِ زِہ میں تڑپی، مگر اس کی آنکھوں میں درد نہیں، ایک نئے سورج کے طلوع ہونے کی چمک تھی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے فون ملایا۔

''بابو'' سوکھے ہوئے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی......

''ڈارلنگ! ڈیوٹی کے وقت کیوں یاد کیا؟''

''بابو......لگتا ہے کہ وقت آ گیا ہے......''

مجید ہنسا، ''اگر بیٹا ہوا تو میں اسے ستاروں تک پہنچاؤں گا......''

''اور اگر بیٹی ہوئی تو میں اسے شفا دینے والا فرشتہ بناوں گی......'' سعدیہ نے جواب دیا۔

اسپتال کے صحن میں مجید کی آہٹیں امید کی دھڑکنیں بن گئی تھیں۔اچانک آواز ابھری ''مبارک ہو! آپ کو بیٹا ہوا ہے!'' مجید کے چہرے پر صبحِ نو کا سورج اتر آیا۔ ان کے آشیانے میں پہلی بار بہار اتری۔ بچے کا نام شبروز رکھا گیا..... روشنی اور رات کا حسین ملاپ..... شبروز پروان چڑھتا گیا۔ماں باپ اپنی خواہشیں نچوڑ کر اس کی کتابوں میں بُن دیتے۔

خود پرانی گدڑی اوڑھتے، مگر اسے نیا لباس پہناتے۔

خود ننگے پیروں چلتے، مگر اس کے لئے مضبوط جوتے خریدتے۔

خود سوکھی روٹی کھاتے، مگر اس کے لئے دودھ اور پھل رکھتے۔

شبروز کے خوابوں کی عمارت اُن کی ہڈیوں اور تھکن پر کھڑی تھی۔ وقت کا پہیہ گھومتا گیا، اور وہ شہر جا کر آئی اے ایس کی تیاری کرنے لگا۔وہ زرینہ سے محبت کرنے لگا.... جو ستارے اپنی آنکھوں میں لیے پھرتی تھی۔

دونوں نے کے اے ایس کا امتحان پاس کیا۔خبر گاؤں پہنچی تو مجید اور سعدیہ کی جھریوں میں پھول کھل اُٹھے۔انہوں نے کئی گھروں میں مٹھائیاں بانٹیں اور ہر صبح دروازے پر نظریں جما کر بیٹھ جاتے۔شبروز آئے گا...... وہ ضرور آئے گا......

مگر مہینے گزر گئے۔فون کی گھنٹی خاموش رہی۔ایک دن سعدیہ دھیمی آواز میں بولی ''بابو...... کیا ہمارا بیٹا ہمیں بھول گیا؟''

مجید نے لرزتی سانسوں میں تسلی باندھی ''نہیں ڈارلنگ...... وہ ہمیں حیران کرنا چاہتا ہوگا......''

مگر حیرانی اس سے زیادہ تلخ نہ ہوسکتی تھی کہ زرینہ اور شبروز نے شہر کے ایک بڑے ہوٹل میں شادی کرلی......

اور والدین تک نہ بلائے گئے۔ایک صبح دونوں لرزتے قدموں سے شہر پہنچے۔ معلوم ہوا شبروز نے گلی نمبر 102 میں نیا بنگلہ خریدا ہے۔

وہ دروازے تک پہنچے، مگر گیٹ پر پولیس نے تڑاخ سے کہا: ''صاحب کسی سے نہیں ملتے۔ ہٹ جاؤ!''

''بیٹے......ہم اس کے ماں باپ ہیں......'' سعدیہ کی آواز موم تھی مگر جواب لوہے کا۔

پولیس والا ہنسا ''یہ گدڑی پہننے والے آئی اے ایس آفیسر کے والدین؟ ہاہا!''

اُسی لمحے سیاہ گاڑی آ کر رکی۔

نیلے کوٹ، کالے چشمے اور غرور کے بوجھ تلے دبے شبروز باہر آیا۔

چشمہ نیچے سرکاتے ہوئے بولا:

''کون ہو تم؟''

''بیٹا! ہم تمہارے والدین ہیں......''

آواز میں دعا کا لرزہ تھا۔

زرینہ غرور سے بولی ''یہ لوگ افسر کے والدین؟ ان جیسے فقیروں کو بھی کوئی حق ہے؟''

شبروز نے سرد لہجے میں کہا ''میرے والدین مر چکے ہیں۔ ڈرائیور، گاڑی نکالو!'' گاڑی دھول اُڑاتے آگے نکل گئی۔

پولیس نے انہیں دھکے دیتے ہوئے گلی سے بھی باہر کر دیا۔

سانسیں رُک گئیں، لیکن آنکھوں میں امید کی لاش ابھی گرم تھی۔ بھوک اور بیماری نے گھیر لیا۔ایک رضا کار انہیں اولڈ ایج ہوم لے آیا۔ کچھ ہی دن بعد مجید ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔اور سعدیہ کی آنکھیں دروازے پر ٹکی رہیں.... جیسے وہ کہتی ہوں ''میرے بیٹے کے قدموں کی آہٹ آئے گی......''

ایک دن اولڈ ایج ہوم دولہن کی طرح سجا۔ ضلع مجسٹریٹ آیا۔ بوڑھے صحن میں جمع ہوئے مائیک پر اس کی گونجدار آواز اٹھی ''کاش اولاد اپنے والدین کا سہارا بنتی...... '' کاش انہیں اولڈ ایج ہوم میں آخری سانسیں نہ لینی پڑتیں...... '' جب یہ الفاظ سعدیہ کی کانوں تک پہنچ گئے تو انہوں نے جھٹ سے پہچان لیا کہ یہ میرا بیٹا شبروز ہے مگر آنکھوں کی بینائی نے اس کو پہچاننے سے انکار کر دیا......

اس وقت انہوں نے پیچھے سے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اٹھایا اور کھڑی ہوگئی۔ آواز ٹوٹی کٹیا کی طرح لرز رہی تھی '' بیٹے...... اگر کہیں میرا شبروز ملے...... تو اسے کہنا کہ اس کا باپ یہیں مر گیا...... اور اس کی ماں ابھی تک اس انتظار میں ہے...... کہ میرا بیٹا ضرور آئے گا...... ''

ہال پر موت جیسی خاموشی چھا گئی۔ ہوا بھی رک گئی۔

سعدیہ زمین پر گر پڑی۔

ہونٹوں میں آخری لفظ مچلا...... ''شبروز...... ''

اور سانس ہمیشہ کے لیے رک گئی۔

کسی نے آہ تک نہ کی۔

خاموشی کی دیوار سب کے دلوں پر گر پڑی۔

☆☆

امانت کا درخت

ایک دن گاؤں میں خبر پھیلی کہ شہر کی ایک بڑی کمپنی نئی سڑک اور عمارتیں بنانے کے لیے زمینیں خرید رہی ہے۔ زمینوں کی قیمتیں آسمان چھونے لگیں۔

اسی دوران ریاض ملک رمضان کے پاس آیا۔

اس نے مسکراتے ہوئے کہا: ''رمضان بھائی! اگر آپ اپنا یہ کھیت اور درخت بیچ دیں تو میں آپ کو اتنی رقم دوں گا کہ آپ شاہانہ زندگی گزاریں گے۔''

رمضان کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اس نے پوچھا: ''کتنی رقم؟''

ریاض نے ایک پرچی پر لکھا، رمضان کے ہاتھ میں تھما دی۔

رقم دیکھ کر اس کے ہاتھ کانپ گئے...... اتنے پیسے اس نے خواب میں بھی نہیں سوچے تھے۔ اسی رات رمضان گھر آیا تو آسیہ نے اس کے چہرے پر لالچ کی پرچھائیں محسوس کی۔

اس نے نرمی سے کہا:

''رمضان! یہ درخت امانت ہے، اسے بیچ کر ہم کیسے سکون سے جی سکیں گے؟''

مگر رمضان بولا: ''آسیہ! دولت آنے دو، پھر کوئی ہمیں کمزور نہیں کہے گا۔''

بیٹا عابد خاموش بیٹھا سنتا رہا اور پھر دھیرے سے بولا:

''ابو! دادا کہتے تھے امانت خیانت نہیں ہوتی...... کیا ہم ان کی بات بھول جائیں گے؟''

رمضان کا دل لمحہ بھر کے لیے لرز اٹھا، مگر ریاض کی دی ہوئی چمکتی ہوئی رقم کا خیال اس کی ہر

کمزوری پر غالب آ گیا۔

اگلے دن گاؤں کے بڑے، چوہدری نذیر، نے پنچایت بٹھائی۔

انہوں نے کہا: ''رمضان! یہ درخت سب کا سہارا ہے۔ تم اسے بیچ کر غریبوں کی امید نہ ڈھاؤ۔ لالچ ہمیشہ اپنے انجام سے پہلے انسان کو اندھا کر دیتا ہے۔''

رمضان نے سخت لہجے میں جواب دیا: ''یہ میری زمین ہے، میرا حق ہے! میں جسے چاہوں بیچوں!''

سلیم نے ہاتھ جوڑ کر کہا: ''بھائی! دولت ہمیشہ خوشی نہیں دیتی، کبھی کبھی انسان کو برباد بھی کر دیتی ہے۔'' مگر رمضان اپنی ضد پر اڑا رہا..... ایک طوفانی رات رمضان چھپ کر لکڑ ہاروں کو لے آیا۔ کلہاڑی کی پہلی ضرب کے ساتھ درخت ایسے چیخا جیسے کوئی زندہ جسم درد سے تڑپ رہا ہو۔

ہوا رک گئی، بادل گرجنے لگے، اور فضا میں ایک غیر معمولی خاموشی چھا گئی۔

اسی وقت سلیم، عابد اور گاؤں والے بھاگتے ہوئے آئے۔

عابد رو کر بولا: ''ابو! مت کاٹیے! یہ دادا کی نشانی ہے، غریبوں کا سہارا ہے!''

رمضان نے غصے میں دھکا دے کر عابد کو دور کر دیا اور آخری وار کیا...... درخت زمین پر گر گیا۔ اسی لمحے آسمان پھٹ پڑا۔ ایسی بارش اور آندھی آئی کہ گاؤں لرز اٹھا۔ درخت کے گرنے سے پانی کا رخ بدلا اور سیلاب سیدھا رمضان کے کھیتوں کی طرف بھاگا۔ رمضان کے سامنے اس کی پوری زمین تباہ ہوتی گئی..... کھیت، گھر، اناج..... سب پانی میں بہہ گیا۔ صبح جب طوفان تھما، رمضان ٹوٹی ہوئی چارپائی پر بیٹھا رو رہا تھا۔ سلیم نے آنکھوں میں آنسو لیے کہا: ''دوست! ہم تمہیں روک رہے تھے..... مگر لالچ نے تمہیں سننے نہیں دیا۔''

رمضان نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا: ''میں نے سوچا تھا دولت سے سب کچھ بدل

جائے گا......مگراس نے تو مجھے خود سے بھی محروم کر دیا۔ کاش میں جانتا کہ امانتیں بیچی نہیں جاتی......نبھائی جاتی ہیں۔''

گاؤں والوں نے اسی جگہ ایک نیا پودا لگا دیا اور ایک تختی نصب کی:

''لالچ انسان کو اندھا بھی کرتا ہے، اور بے آسرا بھی۔''

رمضان نے پودے کو چوم کر کہا:'' مجھے معاف کرنا اے امانت کے درخت! میں نے تجھے دیر سے پہچانا۔''

☆☆

ماں کی تڑپتی روح

عمران کو گذرے دو سال بیت چکے تھے۔ مگر ان دو سالوں میں حلیمہ، اُن کی بیٹی سکینہ اور ننھے بیٹے شاہد نے جتنے دکھ سہے، شاید پوری زندگی میں نہ سہے ہوں۔ عمران کے مرنے کے کچھ ہی دن بعد اُس کے چھوٹے بھائی سجاد نے انہیں دھکے دے کر گھر سے نکال دیا تھا۔ گھر سے نکلتے ہوئے سجاد نے سنگ دل آواز میں کہا تھا ''بھائی تب ہی بھائی ہوتا ہے جب تک وہ زندہ ہو۔ مر گیا تو رشتہ ختم۔''

حلیمہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولی ''کیا تمہیں یاد نہیں کہ میں اور عمران نے تمہیں کس ناز سے پالا؟ شادی کے لئے عمران نے بینک سے قرضہ بھی لیا تھا!''

سجاد ہنسا، جیسے دل میں انسانیت کی کوئی رمق باقی نہ رہی ہو۔ ''ہاں یاد ہے۔ لیکن یہ سب تم لوگوں کا فرض تھا، احسان نہیں۔''

بے گھر زندگی حلیمہ اب چوکی دار کے ایک پرانے مکان میں کرایہ پر رہتی تھی۔ مزدوری کرتی، بچوں کو پلاتی روٹی کھلاتی، اور شب و روز کی جنگ لڑتی۔ ادھر سجاد ایک حج اور دو عمرے ادا کر چکا تھا اور تیسرے عمرے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔

ایک روز وہ حلیمہ کے ٹوٹے ہوئے گھر آیا۔ اس کی جیب سے ایک سو روپے کا نوٹ نکال کر سکینہ کے آگے بڑھاتے ہوئے بولا ''یہ لو دوپٹہ خرید لینا، اور جمعرات کو دعوت میں ضرور آنا،

میری فلائٹ جمعہ کو ہے۔‘‘

حلیمہ کونے میں سہمی بیٹھی تھی، اس کے دل میں خوف تھا کہ کہیں چوکیدار انہیں کرایہ نہ دینے پر یہاں سے بھی نکال دے۔ اُس نے دھیرے سے کہا: ’’بیٹی! چچا کو تمہارا پھٹا ہوا دوپٹہ تو نظر آیا، مگر تمہارے پھٹے کپڑے نظر نہیں آئے...... میرا ٹوٹا ہوا دل نظر نہیں آیا‘‘ ......ننھا شاہد پاس بیٹھے کھیل رہا تھا۔ معصوم لہجے میں بولا ’’ممی...... یہ کون ہے؟ اس نے بہنا کو تو روپیہ دیا، مجھے نہیں دیا؟‘‘

سجاد آگ بگولہ ہو گیا۔ ’’تو تم نے اپنے بچوں کو بھی میری نفرت سے بھرا ہے؟ انہیں نہیں بتایا کہ میں ان کا چچا ہوں؟ منحوس کہیں کی!‘‘

حلیمہ چیخی: ’’کون سا چچا؟ جو ہمیں گھر سے دھکے دے کر نکال دے؟ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو!‘‘

اچانک ایک زور دار چانٹا اُس کے رخسار پر پڑا۔ پھر سکینہ کو بھی مارا اور پاگلوں کی طرح دروازہ کھول کر نکل گیا۔ چند دن بستر پر پڑی رہنے کے بعد حلیمہ مر گئی۔ اس کی قبر پر گھاس بھی ابھی پوری نہیں اُگی تھی کہ بچوں کو کرایہ نہ دینے کی وجہ سے چوکی دار نے بھی گھر خالی کروا دیا۔ وہ دونوں گاؤں چھوڑ کر بھٹکتے ہوئے ایک درخت کے نیچے سو گئے۔

وہاں سے مولا رام نام کا ایک ہندو گزرا۔ بچوں پر نظر پڑی تو اپنا شال اتار کر ان پر ڈال دی۔ جب بچے جاگے تو حیرانی سے بولے ’’یہ چادر ماں نے ڈالی ہو گی‘‘ ......

’’نہیں، ضرور باپ نے ڈالی ہو گی‘‘ ......

مولا رام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پوچھا ’’تم کون ہو بچو؟‘‘

سکینہ نے روتے ہوئے بتایا: ’’ہم عمران کے بچے ہیں۔ چاچا ہمیں بھی مارنا چاہتا تھا، ہم

بھاگ آئے۔"

مولارام نے انہیں بازوؤں میں بھرتے ہوئے کہا:

"اب تم میرے بچے ہو۔کوئی تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔"

اس نے انہیں پالا، پڑھایا، نئی زندگی دی۔لڑکے کا نام راج کمار اور لڑکی کا نام شکنتلا رکھا۔

دونوں پڑھ لکھ کر بڑے ہوئے، شادی ہوئی۔

راج کمار مجسٹریٹ بن گیا۔

پچیس سال بعد وہ سرکاری دورے پر اپنے پرانے گاؤں مکھن پور گیا۔ماں کی قبر پر اگر بتیاں جلائیں، ہاتھ اٹھائے اور نمبردار سے پوچھا "چوکی دار کہاں ہے؟"

جواب آیا "ایک سال پہلے انتقال ہوا۔"

پھر وہ اُس بوسیدہ مکان کے سامنے رکا جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔آنکھیں برسنے لگیں۔

نمبردار نے پوچھا "کیا مکان دیکھ کر رونا آیا؟"

"نہیں۔میری اس مکان سے بہت ساری یادیں وابستہ ہیں اس مکان میں کبھی ایک بیوہ رہتی تھی۔اس کے دیور کا نام کیا تھا؟"

نمبردار بولا "حاجی سجاد۔بہت برا انسان۔اس کے بیٹے نے خودکشی کی اور یہ خود بستر مرگ پر ہے۔" وہ حاجی سجاد کے گھر گیا۔

سجاد ایک زندہ لاش کی طرح بستر پر پڑا تھا۔مجسٹریٹ نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا "چاچا......میں وہی شاہد ہوں۔میں تمہیں معاف کرتا ہوں، مگر ماں کی روح آج بھی تڑپ رہی ہے۔"

نمبردار حیران ہو کر بولا ’’آپ تو ہندو ہیں؟‘‘

’’نہیں......میں وہ ہوں جسے دنیا نے ٹھکرا دیا تھا اور ایک ہندو نے گلے لگایا تھا۔ مذہب انسانیت ہوتا ہے۔‘‘

چند دن بعد خبر آئی ’’حاجی سجاد انتقال کر گیا۔‘‘ اور مجسٹریٹ اس کی تعزیت کیلئے وہاں گیا اور اپنے باپ کے نام پر بچوں کے لئے اسکول اور ماں کے نام پر ’’حلیمہ باجی اولڈ ایج ہوم‘‘ کی بنیاد رکھی۔

☆☆

چاندرات کا مہمان

سورج ڈوب چکا تھا، چاندرات تھی، آسمان پر تارے جگمگا رہے تھے، محمد سبحان اسپتال کی بالکونی پر کھڑا آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا، اس کے چہرے پر خوشی کے آثار نمودار تھے، وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا اور مسکرا رہا تھا.... ادھر اندر سے چیخنے کی آواز آ گئی اور فوراً سلیمہ دایہ نے آواز دی....

ارے سبحان سنتے ہو.... نئے مہمان کی آمد مبارک ہو....

اسپتال میں شور کی وجہ سے سبحان نے ان کی آواز اچھی طرح سے نہیں سُنی مگر جواب دیا کہ آ رہا ہوں....

سبحان اندر آیا تو بچہ دایہ کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ فوراً بولا.... بیٹا ہوا ہے یا بیٹی....

پہلے آپ مجھے مٹھائی کھلا دو، اس کے بعد بتاتی ہوں۔ سبحان نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پانچ سو روپے کا نوٹ نکال کر دایہ کو دے دیا اور دایہ نے فوراً بچے کو سبحان کے ہاتھوں میں تھما دیا...... یہ لو سبحان بیٹا ہوا ہے......

یہ سن کر سبحان کی خوشی کی انتہا نہ رہی کیوں کہ یہ بیٹا ان کو شادی کے بارہ سال بعد پیدا ہوا تھا وہ اپنی بیگم کی طرف دیکھنے لگا جو پاس میں ہی بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ پیلا چہرہ، سفید سکڑتے ہونٹ، مُرجھائی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ بھی کتنی خوش تھی مگر دردِ زہ کی وجہ سے اظہار نہیں کر پا رہی تھی، جوں ہی اس کی نظر محمد سبحان پر پڑی اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے مگر اپنے آنسو

چھپانے کیلئے وہ تھوڑا سا مسکرائی اور دھیمی آواز میں بولی میں نے آپ کو کہا تھا نا کہ بیٹا ہی ہوگا....

ہاں.... کہا تھا۔سبحان نے مسکراتے ہوئے کہا.... اب جایئے اور بچے کیلئے کچھ کپڑے وغیرہ خرید کر لایئے اور ہاں گھر میں اس وقت کسی کو فون نہ کرنا وہ سو رہے ہوں گے.... جی.... وہ کمرے سے نکلنے ہی والا تھا کہ فون بجنے لگا.... ٹرن ٹرن ٹرن۔

کون ہے؟ بیگم نے پوچھا....

ماں ہے.... ہاں، ماں.... ہاں ٹھیک ہوں.... وہ بھی ٹھیک ہے.... ہاں.... بیٹا ہوا ہے.... ہاہاہاہا.... خیر مبارک.... نہیں شکر ہے اللہ کا آپریشن نہیں ہوا.... کوئی نہیں.... کل آنا.... آپ نے دوائی کھائی.... بابا سو گئے کیا؟.... نہیں وہ اس وقت آرام میں ہے.... نہیں کوئی نہیں.... کل میں ویڈیو کال کروں گا.... شاید کل ہی چھٹی ملے گی.... ہاں سو جایئے.... خدا حافظ اور فون کاٹتے ہی باہر نکل گیا....

تھوڑی دیر بعد سبحان بچے کیلئے کپڑے لے آئے اور دایہ نے وہ کپڑے بچے کو پہنا دیئے.... لیجیے اب بچے کو دودھ پلایئے....

مریم نے بچہ کو لے لیا اور دودھ پلانے لگی.... جوں ہی اس کی آنکھ لگتی تھی بچہ رونے لگتا تھا...... یہ پوری رات مریم کیلئے سکرات کی طرح گزری اور اگلے روز ان کو اسپتال سے فارغ کیا گیا...... وہ خوشی خوشی گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔گھر کو دلہن کی طرح سجایا گیا، رشتہ داروں کیلئے دعوت کا اہتمام کیا گیا، بچے کا عقیقہ کیا گیا اور دادا نے پردادا کے نام پر اسلم نام رکھا.... اسلم کی پرورش بڑی دھوم دھام سے کی گئی، ان کا داخلہ شہر کے ایک بڑے بورڈنگ اسکول میں کیا گیا وہاں ان کو انگریزی تعلیم تعلیم دی گئی....

ایک دن محمد سبحان کی بیوی نے کہا کہ کہتے ہیں کہ رزاق چچا کا بیٹا ولایت سے مولوی کی تعلیم

حاصل کر کے گھر آیا ہے ان کو گاؤں کے سبھی لوگ دعوت پر بُلا رہے ہیں کیوں نہ ہم بھی ان کو دعوت پر بُلائیں اور اپنے مردوں کیلیئے دعائے مغفرت کروائیں.... اب بابا کو ہی فوت ہوئے دو سال ہو گئے مگر ہم نے ان کیلیئے کبھی بھی کھانا نہیں کھلایا.... محمد سبحان مولانا صاحب کو دعوت پر بلانے کے لیے راضی ہو گئے اور یہ طے ہوا کہ شب جمعہ کو مولانا صاحب کو دعوت پر بُلایا جائے گا اور اسلم کو بھی اسکول سے دو تین دن کے لیے گھر لایا جائے تا کہ وہ بھی دعوت میں شامل ہو.....

اسلم جب چھٹی پر آیا تو دیکھا گھر میں دیگیں پک رہی ہیں اور بہت سارے پکوان پک رہے ہیں.... واٹس اِز دِس موم؟ وائی سو مینی ڈشز؟

بیٹے مجھے آپ کی یہ باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں کیونکہ میں زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہوں اور....

اوہ.... موم.... میرا کہنا ہے کہ آج ہمارے گھر میں یہ کیا چل رہا ہے؟ اور بہت سارے پکوان!....

بیٹے آج ہمارے گھر میں مولوی صاحب کی دعوت ہے اسی لیے یہ سب چل رہا ہے....

مولوی صاحب!!! کون ہیں وہ ان کا ہمارے گھر سے کیا واسطہ ہے....

مولانا صاحب ہمارے گاؤں کے ہی ہیں، وہ ولایت سے پڑھ کر آئے ہیں، پڑوس والی مسجد میں امامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور بچوں کو بھی قرآن کی تعلیم دیتے ہیں....

قرآن کی تعلیم!!!!! مجھے اب شہر کے بڑے اسکول میں پڑھتے پڑھتے چودہ سال ہو گئے مگر آج تک مجھے پتہ ہی نہیں کہ، قرآن، کیا ہے؟ اسے اپنی ماں کی یہ باتیں عجیب لگ رہی تھیں اور ان پر ہنسنے لگا....

قرآن!!!! ہاہاہاہا... میں آج تک سائنس، میتھ، انگلش وغیرہ سُنتا آیا ہوں مگر قرآن!!!!!

بیٹے قرآن تو مسلمانوں کی سب سے بڑی کتاب ہے.... وہ آپس میں یہی باتیں کر رہے تھے کہ کسی نے باہر سے آواز دی کہ مولانا صاحب تشریف لائے ہیں۔

اسلم کو بھی مولوی صاحب کو دیکھنے کا اشتیاق ہو گیا اور وہ جلدی سے باہر نکل گیا.... جوں ہی اس کی نظر مولانا صاحب پر پڑی تو کہنے لگا.... ارے مما یہ کون سی مخلوق ہے بڑی بڑی داڑھی، سر پر دستار، ہاتھوں میں کتاب !!!!! ہاہاہا.... یہ بات سچ ہے کہ اس نے ابھی تک اساتذہ کو پینٹ شرٹ میں دیکھا تھا مگر آج دوسرا لباس بھی دیکھ لیا......

اس کے بابا سبحان نے جب دیکھا کہ اسلم مولانا صاحب کے اوپر طنز کس رہا ہے انہوں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسلم کو چُپ رہنے کا اشارہ دیا......

اسلم چپ تو ہو گیا مگر ہنسی نہیں روکی، جسے مولانا صاحب نے بھی محسوس کیا......اور مولانا صاحب کو اسی کمرے میں لایا گیا جہاں سبحان کے والد رہتے تھے.... سبحان کے والد کے انتقال کے بعد اس کمرے میں کسی نے بھی پیر رکھنے کی ہمت نہیں کی اور وہ اکثر کہتے تھے کہ یہاں کوئی بھوت رہ رہا ہے....

کھانے سے پہلے مولانا صاحب نے محمد سبحان سے اسلم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ یہ خوبصورت نوجوان مہمان کہاں کے ہیں؟

جناب یہ میرا اکلوتا بیٹا اسلم ہے۔

آپ کے بیٹے !!!! مولانا صاحب نے حیران ہو کر کہا.... میں نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا....

جی جناب.... آپ کا فرمانا بجا ہے یہ شہر کے بڑے اسکول میں پڑھتے ہیں اور اب ڈاکٹری کیلئے انٹرنس کی تیاری کر رہے ہیں، آج ہی یہاں آئے ہیں۔

ماشاء اللہ بہت خوب !!!! بیٹے کیا آپ نے قرآن کی تعلیم حاصل کی ہے؟ کیا آپ کے

اسکول میں قرآنی تعلیم کا کوئی انتظام ہے؟ مولانا صاحب ان سے ایسے ہی سوالات پوچھتے رہے۔

نہیں.... سائنس پڑھا، میتھ پڑھا، انگلش.... اسلم نے مضحکہ خیز لہجے میں جواب دیا....

مولانا صاحب ان کی بات کاٹ کر محمد سبحان سے مخاطب ہو گئے.... سبحان صاحب، اپنے بیٹے کو کسی دینی مدرسے میں بھی داخلہ دلانا چاہئے تھا تاکہ یہ قرآن کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اچھے اخلاق، ماں باپ کا احترام، بڑوں کی عزت وغیرہ بھی سیکھتے....

مولانا صاحب پہلے انہیں ڈاکٹر بننے دے دیجئے باقی بھی یہ خود سیکھ لے گا ابھی چھوٹا ہی ہے نا.... سبحان نے کہا....

نہیں!!!! محمد سبحان آپ غلط کہہ رہے ہیں.... لگتا ہے کہ آپ کا بیٹا بگڑ چکا ہے کیونکہ جب سے میں اس گھر میں آیا ہوں تب سے دیکھ رہا ہوں کہ ان کے حرکات وسکنات ٹھیک نہیں لگ رہے ہیں، ان کو تربیت کی بہت ضرورت ہے....

مولانا کی ان باتوں سے محمد سبحان کو بہت تکلیف پہنچی مگر کچھ کہہ نہیں پائے، ان کے دل میں آیا کہ مولانا کو گھر سے نکال دے مگر کیا کرے دعوت پر جو بلایا تھا۔ انہوں نے مولانا کی بات کاٹ کر ان سے پوچھا کہ کھانا لائیں جناب.... ہاں لایئے.... لیکن ان کو کچھ وقت کیلئے محلے میں رکھئے اور مدرسہ بھیج دیجئے بہتر رہے گا....

مولانا صاحب آپ کو پتہ ہے کہ ہمارے محلے کے بچے ٹھیک نہیں ہیں وہ اچھی تعلیم حاصل نہیں کر رہے ہیں اگر یہ ان کے ساتھ رہے گا تو بگڑ جائے گا.... کھانا کھانے کے بعد مولانا صاحب کو رخصت کر دیا گیا....

کچھ روز بعد اسلم کو شہر کی طرف روانہ کیا گیا۔ کئی سال گزر گئے اسلم ڈاکٹر بن گیا اسی دوران اسی محلے کے ایک زمیندار کا بیٹا بھی ڈاکٹر بن گیا۔ خوش قسمتی سے ان دونوں کی تعیناتی ایک

ہی اسپتال میں ہوئی۔

مولانا صاحب مبارکباد پیش کرنے کیلئے زمیندار کے ساتھ محمد سبحان کے گھر بھی تشریف لے گئے.... محمد سبحان بڑے فخریہ انداز میں مولانا صاحب سے مخاطب ہوئے.... مولانا صاحب!!!! اسے تربیت کہتے ہیں آج تک اس گاؤں میں کوئی ڈاکٹر بنا کیا؟ آج دیکھئے میرا بیٹا ڈاکٹر بن گیا ہے اب وہ ڈاکٹر اسلم کہلائے گا....

ہاں!!! ڈاکٹر اسلم تو کہلائے گا مگر....

مگر کیا؟ محمد سبحان نے پوچھا....

تعلیم ایک الگ چیز ہے اور تربیت الگ چیز.... مولانا صاحب نے کہا... اور ہاں..... میرا ایک مشورہ ہے آپ سے، اب آپ دونوں میاں بیوی بوڑھے ہو چکے ہیں اور آپ کو اس بُڑھاپے میں ان کی ضرورت ہے۔ ان کو شہر سے واپس لے آیئے تا کہ آپ کو بھی راحت ملے اور محلّہ کے لوگ بھی ان سے استفادہ کر سکیں......

جی ہاں مولانا صاحب آپ صحیح کہہ رہے ہیں...... محمد سبحان کی اہلیہ بیگم مریم نے کہا.... میں نے کئی بار اس کو سمجھایا کہ اب ہمیں ان کے سہارے کی کافی ضرورت ہے......اور کئی روز سے یہ خود بھی کافی بیمار ہیں آج پوری رات انہیں کھانسی کی وجہ سے نیند نہیں آئی.... ادھر محمد سبحان نے کھانستے ہوئے گلے کو صاف کیا اور مولانا صاحب سے کہا سُنا ہے کہ زمیندار سمندر خان کا بیٹا بھی ڈاکٹر بن گیا اور وہ گھر پر بھی لوگوں کا علاج کرتا ہے سوچتا ہوں کہ میں بھی وہاں جا کر اپنا علاج کروالوں.... اب اُسی پر گزارہ کرنا پڑے گا، اپنے بیٹے اسلم کو بہت بار یہاں بُلایا مگر وہ نہیں آیا....

مولانا صاحب نے ایک آہ بھری اور محمد سبحان سے کہنے لگے کہ اگر آپ نے ان کی دینی اور اخلاقی تربیت کی ہوتی تو وہ آج آپ کے ساتھ ہوتے اور آپ کی خدمت کرتے مگر....

مریم نے مولانا صاحب کی بات کاٹ کر کہا.... نہیں مولانا ایسی بات نہیں ہے ہمارا بیٹا ضرور کسی کام میں الجھا ہوا ہوگا ورنہ وہ ہم سے ضرور ملنے آتا..... اس کے بعد مولانا صاحب مبارکباد پیش کر کے چلے گئے....

سُنتی ہو!!!! مولانا صاحب شاید سچ کہہ رہے ہیں ہم نے اپنا سب کچھ بیچ دیا، انہیں اچھی تعلیم دلائی، اسے ڈاکٹر بنایا مگر انہوں نے ہماری خبر تک نہیں لی کہ آیا میرے والدین زندہ بھی ہیں کہ نہیں میں نے اسے بہت بار فون کال کیا مگر اس نے نہیں اٹھایا.... خیر کل میں زمیندار کے بیٹے کے پاس جاؤں گا اور اس سے کہوں گا کہ اسلم کو کہنا والدین تمہیں یاد کر رہے ہیں اور....

کچھ روز بعد وہ پھر زمیندار کے بیٹے کے پاس گیا اور اپنے بیٹے کی خبر گیری کی اور یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلتا رہا مگر زمیندار کا بیٹا کافی ہوشیار تھا وہ انہیں تسلی دیتا رہا کہ وہ ایک دن ضرور آئے گا.... مگر یہ بات کسی کو بھی پتہ نہیں تھی کہ ڈاکٹر اسلم زمیندار کے بیٹے سے یہ سوچ کر بات تک نہیں کرتا تھا کہ میں شہر کے بڑے اسکول میں پڑھا ہوں اور زمیندار کا بیٹا گاؤں کے گورنمنٹ اسکول میں..... یہ باتیں زمیندار کے بیٹے نے صرف مولانا صاحب سے ہی کہی تھیں....

ایک روز، محمد سبحان اپنے آنگن میں لگی چارپائی پر دھوپ سینک رہے تھے کہ وہ اچانک زمین پر گر پڑے.... ان کی بیگم مریم دوڑتے آئیں اور ہمسایوں کو بلانے لگی.... ان کے اردگرد بہت سارے لوگ جمع ہو گئے اور انہیں اسپتال لے جانے کیلئے آمادہ ہوئے....

ان کا بیٹا خود ایک ڈاکٹر ہے وہ اس کا علاج اچھی طرح سے کروائے گا، گاؤں کے ساہوکار نے کہا.... نہیں آج زمیندار کا بیٹا چھٹی پر ہے ہم اس کو اسی کے پاس لے جائیں گے تاکہ وہ ان کا علاج کرے، ایک نوجوان نے کہا....

ہاں تم سچ کہہ رہے ہو ساہوکار نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور انہیں زمیندار کے بیٹے کے پاس لے جایا گیا.....

زمیندار کے بیٹے نے ان کی نبض دیکھی تو کچھ دوائیاں مفت میں دے دیں اور گاؤں والوں سے کہا کہ ایک دو دن بعد میرے پاس آئیں تا کہ ہم ان کی جانچ اسپتال میں اچھی طرح سے کروائیں.... ہاں.... ڈاکٹر صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ساہوکار نے کہا اور ہمیں بھی اسی بہانے ان کے بیٹے سے ملنے کا موقع بھی ملے گا.... میں بھی ساتھ آرہا ہوں.... دو دن بعد ساہوکار اور دونو جوان محمد سبحان کو لیکر سویرے زمیندار کے گھر پہنچے اور وہاں زمیندار کا ڈاکٹر بیٹا ان کا انتظار کر رہا تھا اور انہیں اپنی گاڑی میں اسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔ اسپتال پہنچتے ہی ان کی جانچ کی گئی اور جانچ سے پتہ چلا کہ وہ پھیپھڑوں کے موذی مرض میں مبتلا ہیں.... ڈاکٹروں نے کہا اس بیماری کا علاج ڈاکٹر اسلم ہی کر رہے ہیں اور ہاں ڈاکٹر اسلم تو آپ کے گاؤں کا ہی ہے ایک اور ڈاکٹر نے کہا.... یہ سُن کر وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے......

جب وہ ان کو لے کر وارڈ میں پہنچے تو ڈاکٹر اسلم ایک لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ انگریزی زبان میں محو گفتگو تھے....

السلام علیکم اسلم بیٹے.... ساہوکار نے سلام کیا.... مگر ڈاکٹر اسلم نے سلام کا جواب نہیں دیا.... کون ہے یہ جو آپ کو بیٹا کہہ کر پکار رہا ہے؟.... لیڈی ڈاکٹر نے اسلم سے پوچھا.....

ہو گا کوئی گاؤں کا گنوار شخص.... اسلم نے جواب دیا اور ان لوگوں سے مخاطب ہو کر بڑی بے رخی سے پوچھا.... کون ہے یہ اس کو یہاں کیوں لے آئے انہیں او پی ڈی میں لے کے جایئے....

جناب یہ محمد سبحان ہیں.... کیا آپ نے انہیں نہیں پہچانا....

او مائی گاڈ.... کیسے لوگ ہیں یہ.... یہاں تو اس جیسے محمد سبحان روز آتے ہیں اور ان کے پیچھے کھڑا زمیندار کے بیٹے سے مخاطب ہو کر کہا کہ.... اے زمیندار کے بیٹے آپ ان جیسے ادھ مرے بوڑھوں کو میرے پاس کیوں لاتے ہو ان کو کہیں اور لے جاؤ اور وہیں سے علاج کراؤ.... مگر یہ محمد سبحان ہیں، آپ کے والد، ساہوکار نے کہا....

کیا!!! وہ چونک گیا اور اپنی کرسی سے فوراً اٹھا اور اپنے نیم مردہ والد کی جانچ کرنے لگا مگر وقت نکل چکا تھا، انہیں بیڈ پر لٹا دیجئے، کچھ ہی دیر بعد سبحان نے کہا کہ میرے بیٹے ڈاکٹر اسلم کو بُلا کر لے آیئے.... وہی میرا علاج کر سکتا ہے.... یہ کہ کر وہ انتقال کر گئے اور سب کی آنکھیں نم ہو گئیں سوائے ان کے بیٹے ڈاکٹر اسلم کے.... اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ پیسے نکالے اور ساہوکار کے ہاتھوں میں اس طرح تھما دیئے کہ جیسے لگتا تھا کہ ساہوکار بھیک مانگ رہا تھا اور انہوں نے دے دی....

یہ لیجیے پیسے ان پیسوں سے ان کی تجہیز و تکفین کر دیجئے اور جو پیسے بچ جائیں گے ان سے غریبوں کو کھانا کھلا دیجئے گا۔ اور ہاں اگر کچھ اور پیسوں کی ضرورت پڑی تو میرے پاس آ کر لے جایئے گا.... یہ باتیں سُن کر وہ سبھی ششدر رہ گئے اور ساہوکار کے ہاتھوں سے وہ پیسے گر گئے.... ادھر ایک نوجوان نے طیش میں آ کر پیسے اٹھائے اور ڈاکٹر اسلم کو یہ کہہ کر واپس کر دیئے کہ تجہیز و تکفین ہماری محلّہ کمیٹی برداشت کرے گی اور غریبوں کو کھانا بھی ہم ہی کھلائیں گے.... ہم پر یہ احسان نہ کریئے اور یہ کہتے کہتے محمد سبحان کی لاش لے کر نکل گئے.... محلے میں ماتم چھایا ہوا تھا ہیں بڑے اعزاز کے ساتھ دفنایا گیا اور لوگوں کو چوتھے کی دعوت بھی دی گئی مگر جس بیٹے کو انہوں نے بڑے ارمانوں کے ساتھ ڈاکٹر بنایا تھا وہ نہیں آیا.... لوگوں کو مولانا صاحب کی بات یاد آ رہی تھے کہ اولاد کی دینی اور اخلاقی تربیت

ضروری ہے اور ان کی قبر پر ایک بڑا کتبہ لگا دیا جس پر لکھا تھا ''ان زخموں کے نام جو چیخ نہیں سکتے تھے۔ اس لیے خاموش لہو بن کر آنکھوں سے بہہ نکلے۔''

☆☆

اس شب

رات سہانی تھی۔ آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے اور زمین پر گہری خاموشی کا بسیرا تھا۔ لوگ اپنے گھروں میں بیوی بچوں کے ساتھ محوِ گفتگو تھے۔ میں بھی پلنگ پر لیٹا ہوا تھا اور میری نگاہیں کھڑکی سے جھانکتے ان جھلملاتے ستاروں پر ٹک گئی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مجھے اپنی طرف بلا رہے ہوں۔

اسی لمحے میرے دل میں خیال آیا کیوں نہ میں آج آسمان کی سیر کروں؟

میں نے رختِ سفر باندھ لیا۔ ایک کیمرہ، ایک دوربین اور آکسیجن کا سلنڈر ساتھ لیا۔ اڑان کے لیے میں نے ایک چھوٹا سا طیارہ تیار کیا تھا، جس پر باہر سے ربر کی ایک موٹی پرت چڑھائی تھی تاکہ سورج کی تیز کرنیں اسے نقصان نہ پہنچا سکیں۔

چند لمحوں بعد طیارہ فضا میں بلند ہوا۔ جیسے ہی زمین نیچے چھوٹی ہوتی گئی، دل میں ایک عجیب سا ولولہ جاگ اٹھا۔ ہوا شفاف، فضا اجلی اور ستارے قریب آتے ہوئے دکھائی دیے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کسی جادوئی دنیا میں قدم رکھ رہا ہوں۔

کچھ ہی دیر میں میں ایک جھلملاتے ستارے کے قریب جا پہنچا۔ وہاں کوئی خاموشی نہیں تھی بلکہ روشنی کی مدھر لہریں تھیں جو موسیقی کی طرح میرے دل پر دستک دے رہی تھیں۔ اچانک ایک کرن مجسم ہو کر میرے سامنے آئی اور بولی ''تم زمین والے لوگ ہمیں دور سے دیکھ کر خوش ہو جاتے ہو، مگر آج تم ہمارے قریب آئے ہو۔ یہ ہمت ہر کسی میں نہیں ہوتی۔''

میں نے مسکرا کر کہا ''میں بچپن سے تمہاری چمک کا اسیر ہوں۔ آج سوچا کہ تمہیں قریب سے دیکھوں اور یہ راز جانوں کہ تم کیوں ٹمٹماتے ہو۔''

وہ کرن ہنس پڑی اور بولی ''ہم اس لیے ٹمٹماتے ہیں تاکہ تم زمین والوں کو یہ یاد رہے کہ اندھیروں کے باوجود روشنی ہمیشہ باقی رہتی ہے۔''

یہ سن کر میرے دل میں سکون کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میں نے اپنی دوربین سے اور بھی کئی سیارے اور کہکشائیں دیکھیں۔ ہر منظر ایک نیا طلسم تھا، ایک نیا راز۔

وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ جب میں واپس زمین پر لوٹا تو صبح کا اجالا پھیل رہا تھا۔ میں نے سوچا شاید یہ سب ایک خواب تھا، مگر جب میں نے کیمرہ کھولا تو اس میں روشن کرنوں اور دور کہکشاؤں کی تصویریں قید تھیں۔ اس لمحے میں سمجھ گیا کہ یہ سب حقیقت تھی۔ اور وہ ستارے واقعی انسان کو اپنے قریب بلاتے ہیں، بس شرط یہ ہے کہ آدمی میں خواب دیکھنے اور انہیں حقیقت بنانے کا حوصلہ ہو۔

☆☆

دھول

میں تھا، میرا دوست اکرم تھا، اور ایک بوڑھا چنار کا درخت....

وہی درخت جس کے نیچے ہم بچپن سے بیٹھا کرتے تھے، باتیں کرتے، خواب بُنتے، اور اپنے من کے بوجھ ہلکے کرتے تھے۔ یہ درخت ہماری باتوں کا خاموش گواہ بن چکا تھا.... جیسے اس کی بھی ہم سے دوستی ہوگئی ہو۔ کہتے ہیں دیواروں کے کان ہوتے ہیں، مگر دیوار تو بے جان ہوتی ہے۔ اگر دیوار سن سکتی ہے تو درخت کیوں نہیں؟ وہ جاندار ہے، سانس لیتا ہے، سایہ دیتا ہے، اور شاید ہماری باتیں بھی سنتا ہے۔ اس چنار کے نیچے ہم نے بچپن کے کئی راز کہے، کئی دکھ بانٹے، کئی امیدیں بوئیں۔ وقت گزرتا گیا۔ میں استاد بن گیا اور اکرم بجلی کے محکمے میں کیجول لیبر۔ بیس برس بعد جب اس کا نام مستقل ملازمین کی فہرست میں آیا تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ مگر لسٹ کے بعد کچھ نہ ہوا۔ نہ کوئی آرڈر، نہ کوئی خط، نہ کوئی خوش خبری میں اکثر اس سے پوچھتا، ''اکرم، کچھ خبر آئی؟'' وہ مسکرا کر کہتا، ''دو دن میں نکلیں گے آرڈر، بڑے صاحب نے فائل چھوٹے صاحب کے حوالے کر دی ہے۔'' دو دن گزر جاتے، پھر کہتا، ''اب انکوائری ہوگی، جلد سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' یوں ہی دس سال بیت گئے۔ فائلیں وہیں کی وہیں، جیسے کسی نے ان پر دھول ڈال کر بھلا دیا ہو۔ اسی دوران اس کی بڑی بیٹی کی شادی طے ہوئی۔ اس نے بنک سے قرضہ لیا، اس یقین کے ساتھ کہ ''اب تو ہمارا آرڈر آنے والا ہے۔'' مگر قسمت کچھ اور لکھ چکی تھی۔ ایک دن میں اسکول میں تھا۔ بورڈ پر

کچھ لکھ ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ دیکھا تو گاؤں کے چوکیدار کا فون تھا۔ میں نے سوچا، کلاس کے بعد بات کرلوں گا۔ مگر فون پہ فون آنے لگے.... کبھی بیوی کا، کبھی ہمسائے کا دل دھڑکنے لگا۔

میں نے فون اٹھایا تو ہمسائے کی کپکپاتی آواز آئی: ''اکرم کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔'' میرے ہاتھوں سے فون گر گیا۔ جب ہمت جتائی تو پوچھا، ''کیا وہ...؟''

جواب آیا: ''وہ نہیں رہا۔''

زمین میرے پاؤں تلے سے نکل گئی۔ میں دوڑا، گاؤں پہنچا۔ وہاں اکرم کی لاش پڑی تھی.... جلی ہوئی، مسخ شدہ، پہچانی نہ جاتی۔ کہا گیا کہ اسے بجلی کا کرنٹ لگا تھا، مگر میں جانتا تھا... اسے کرنٹ نے نہیں، نظام نے مارا تھا۔ محکمے کی الماریوں میں اس کے نام کی فائل اب بھی پڑی تھی.... دھول میں اٹی، بھولی ہوئی۔ وہی دھول جو برسوں اس کے خوابوں پر جمی رہی۔ اکرم کی بیٹی کی شادی قرض سے ہوگئی، مگر اس قرض کو اتارتے اتارتے اس کے بچے بوڑھے ہو گئے۔ نہ محکمے نے کوئی مدد کی، نہ بنک نے رحم کیا۔

اور اس کے نام کی فائل اسی طرح دھول میں دفن رہی، جیسے اکرم کی لاش مٹی میں دفن ہو گئی۔ آج بھی ہر بجلی کے دفتر میں یہی سننے کو ملتا ہے: کہ ''ڈیلی ویجرز کو جلد مستقل کیا جائے گا۔'' مگر ان میں سے اکثر اب زندہ نہیں۔ جو ہیں، وہ بھی ریٹائرمنٹ کے قریب ہیں.... اکرم کی طرح، دھول چاٹتے، امید کرتے، زندگی اور نظام کے درمیان پسے ہوئے۔

☆☆

کون مرا؟

صبح کا وقت تھا۔ پہاڑیوں پر دھند کی سفیدی ابھی پوری طرح چھٹی نہ تھی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ بھی جیسے لاک ڈاؤن کی دہشت میں دب کر رہ گئی تھی۔ میں حسب معمول اپنی ڈیوٹی کے لئے تیار ہوا اور گھر سے نکل پڑا۔ گاؤں کے ویران راستے سے ہوتا ہوا مین روڈ پر پہنچا ہی تھا کہ ایک سخت آواز نے میرے قدم روک دیے۔

''او صاحب! رکئے!''

میں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے ایک سپاہی بندوق کے سہارے کھڑا تھا اور تین چار افراد کو سڑک کنارے 'کان پکڑی' میں بٹھایا گیا تھا۔ اس کی آواز میں رعب بھی تھا اور تھکن بھی۔

''کدھر جانا ہے صاحب؟ کرفیو پاس ہے آپ کے پاس؟''

میں نے پرس سے پاس نکال کر دکھایا اور جلدی سے آگے بڑھنے لگا ہی تھا کہ پیچھے سے ان کان پکڑی والوں میں سے ایک آدمی نے لرزتی ہوئی آواز میں پکارا:

''صاحب! ہماری کچھ سفارش کیجئے!''

میں رُک گیا۔ دل میں ایک خلش سی جاگی۔ میں نے مڑ کر سپاہی سے پوچھا:

''ان کی غلطی کیا ہے؟''

سپاہی نے سنجیدگی اور سختی کے ملے جلے انداز میں کہا: ''صاحب! یہ بغیر پاس کے گھر سے نکل رہے تھے۔ سب جانتے ہیں کہ پورے ملک میں لاک ڈاؤن ہے۔ ہمیں ایسے ہی پکڑ پکڑ کر

گھر بھیجنا پڑ رہا ہے۔ ڈیوٹی ہے ہماری۔''

میں نے آہستگی سے کہا: ''بھائی! ہر کسی کے پاس پاس نہیں ہوتا۔ ایمرجنسی میں انسان مجبور ہو جاتا ہے۔''

وہ شخص اچانک اٹھ کر کھڑا ہوا، آنکھوں میں آنسو اور آواز میں لرزش: ''صاحب! میں نے پورا مہینہ گھر کا دروازہ نہیں کھولا۔ بچوں کو باہر نہیں جانے دیا۔ لیکن آج مجبور تھا، بہت مجبور...''

میں نے نرمی سے پوچھا: ''کیا مجبوری تھی؟''

وہ ایک لمحہ چپ رہا پھر جیسے دل کا بوجھ پھٹ پڑا ہو: ''صاحب... میری بیوی دردِ زہ میں مبتلا ہے۔ صبح سے تڑپ رہی ہے۔ بچہ کسی بھی وقت پیدا ہو سکتا ہے۔ گاؤں میں کوئی گاڑی والا نہیں، اس لئے میں دوسرا گاؤں جا کر گاڑی لینے نکلا تھا۔''

میری سانس رک سی گئی۔ ''کتنی دیر ہو گئی؟'' میں نے گھبراہٹ میں پوچھا۔

''آج صبح چھ بجے سے...'' اس نے جواب دیا۔

میں نے تیزی سے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے دس بج رہے تھے۔ یعنی چار گھنٹے سے زیادہ...!

میری روح کانپ اٹھی۔ میں نے سپاہی سے بات کر کے اسے آزاد کروایا اور اس کے ساتھ قریبی گاؤں تک بھاگم بھاگ ایک گاڑی کا انتظام کیا۔ راستے بھر اس کی نگاہیں کہیں دور گم تھیں۔ لبوں پر صرف ایک ہی دعا: ''خدا خیر کرے... خدا خیر کرے...''

جوں ہی ہم اُس کے گاؤں پہنچے، دروازے سے اندر قدم رکھے ہی تھے کہ ایک ننھی سی بچی کی پھٹی ہوئی آواز نے ہمیں لرزا دیا:

''ماں... ماں... اُٹھو ناماں...! دیکھو ابو آ گئے!''

وہ بہ مشکل ڈھائی تین سال کی ہو گی۔ ننگے پاؤں، کانپتے ہونٹ، آنکھیں آنسوؤں سے تر... وہ اپنی ماں کے سینے پر ہاتھ مار مار کے جگا رہی تھی۔

ہم دونوں اندر بھاگے۔ کمرہ مٹی کے دیواروں اور ٹھنڈی ہوا سے بھرا ہوا تھا۔ پلنگ پر ایک عورت بے حس وحرکت لیٹی تھی، چہرے پر عجیب سکون اور موت کی خاموشی۔

وہ شخص آگے بڑھا، دونوں ہاتھوں سے اس کی بانہوں کو جھنجھوڑتے ہوئے چیخ پڑا: ''زہرہ! اٹھو... میں آگیا ہوں... دیکھو میں تمہیں اسپتال لے جاؤں گا... اٹھو زہرہ...!''

مگر زہرہ اٹھنے والی نہیں تھی۔

میں نے لرزتے ہوئے اس کی نبض دیکھنے کی کوشش کی۔ دل کی دھڑکن بند تھی۔ بدن ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

میں نے منہ کی طرف ہاتھ رکھا۔ کوئی سانس نہیں۔

میں نے آہستہ سے سر جھکا کر کہا: ''بھائی... وہ چلی گئی...''

ایک لمحے کو اس کے قدم لڑکھڑائے۔ پھر وہ دھاڑ مار کر رونے لگا۔ مجھے گلے لگا کر چیخ چیخ کر کہنے لگا:

''صاحب! میں برباد ہو گیا... میں برباد ہو گیا...!''

بچی اپنے باپ کے گلے سے لپٹ گئی اور روتی رہی: ''ابو... ماں کیوں نہیں اٹھتی؟ ماں کیوں نہیں بولتی؟''

میں سکتے میں کھڑا سوچتا رہا...

لاک ڈاؤن نے کس کو بچایا؟ سپاہی نے ڈیوٹی کی یا انسان مر گیا؟ قانون جیتا یا زندگی ہار گئی؟ یہاں کون مرا؟

وہ عورت؟ وہ بچہ جو دنیا میں آنے سے پہلے ہی یتیم ہو گیا؟ وہ ننھی بچی جو ماں سے محروم ہو گئی؟ یا انسانیت...؟

میں واپس یہی سوچتے ہوئے نکل آیا... آج پہلی بار مجھے لگا کہ اس وبا میں سب سے

خطرناک وائرس بے حسی ہے۔

کون مرا؟

جو زندہ ہیں وہی مر گئے ہیں۔

☆☆

بالیاں

مجھے یاد ہے، میں تب شاید سات یا آٹھ برس کی تھی۔ میرا سب سے بڑا شوق ...... بالیاں۔

ہاں، وہی سونے کی چمکدار بالیاں جو عورتوں کے کانوں میں ہلتی جلتی تھیں، روشنی پکڑتیں، آنکھوں میں خواب جگاتیں۔ جب بھی کسی عورت کو دیکھتی، میری نظریں سیدھی اس کے کانوں پر جا ٹھہرتیں۔ اگر چند دن کسی عورت کے کانوں میں سونا نہ دیکھتی تو جیسے دل میں اداسی اتر آتی۔ پھر میں بہانے سے ہمسایوں کے گھر چلی جاتی.... کسی شادی، کسی فنکشن، کسی عقیقے کے نام پر۔ وہاں کوئی نہ کوئی ایسی ضرور مل جاتی جس کے کانوں میں بالیاں دمک رہی ہوتیں۔ مجھے نہیں معلوم وہ بالیاں مجھے اتنی پسند کیوں تھیں .... شاید ان کی چمک میں مجھے اپنی محرومیوں کی روشنی نظر آتی تھی۔ ہمارا گھر غریب تھا۔ ابو روزانہ مزدوری پر جاتے، شام کو تھکے قدموں کے ساتھ لوٹتے۔ ممی کبھی سوت کاتتیں، کبھی محلے کے بچوں کو پڑھاتیں۔

ہم بہنیں پانچ تھیں۔ بڑی بہنیں اسکول جاتی تھیں، میں اکثر دروازے پر بیٹھ کر ان کے بستے سونگھتی ...... ان میں نئی کتابوں کی خوشبو آتی تھی۔

ایک دن پھوپھی زیبہ کے بیٹے ناصر کی شادی طے ہوئی۔ جب دعوت نامہ آیا تو گھر میں جیسے عید آ گئی۔ بڑی بہنوں نے نئے کپڑوں کی فرمائش کی، ممی حساب لگانے بیٹھ گئیں۔ میں چپ

چاپ کونے میں بیٹھی سوچ رہی تھی.... شاید شادی میں کوئی عورت ایسی بھی ہو جس کے کانوں میں بالیاں ہوں۔ مگر میں جانتی تھی، ممی مجھے نہیں لے جائیں گی۔ وہ ہمیشہ یہی کہتی تھیں: ''شمہ ابھی چھوٹی ہے، لوگ ہنستے ہیں۔'' مگر اس دن قسمت مجھ پر مہربان ہوئی۔ ابو نے اچانک کہا:

''آج ہماری چھوٹی شمہ بھی ساتھ جائے گی، آخر یہ بھی خاندان کا حصہ ہے!''

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں دوڑ کر اندر گئی، پرانی فراک نکالی، دھوئی، استری کی۔ بڑی بہنوں نے شور مچایا:

''امی! اسے کیوں لے جا رہی ہیں؟ ہم کیوں نہیں؟'' ممی نے دو دو ٹافیاں دے کر ان کا احتجاج ختم کیا۔ میں حیران رہ گئی.... مجھے ایک بھی نہیں دی! دل میں آیا ابو کے پاس شکایت کروں، مگر پھر سوچا شادی میں خود ہی بہت سی مل جائیں گی۔ جب نکلی تو بہنوں کی آنکھوں میں حسد کی چمک تھی۔ میں نے پلٹ کر مسکرا کر دیکھا، جیسے کہہ رہی ہوں:

''یہ دن میرا ہے!''.... پھوپھی کے گھر پہنچے تو عورتوں کی باتوں، ہنسی اور چائے کی خوشبو سے سارا گھر مہک رہا تھا۔ میں دروازے کے پاس ہی بیٹھ گئی، نظریں کانوں کی تلاش میں بھٹکنے لگیں۔ تب اچانک ایک عورت نظر آئی....

اونچی ناک، گندمی رنگ، اور کانوں میں سونے کی بھاری بالیاں۔ وہ بالیاں نہیں، جیسے دو سورج ہوں جو ہر جنبش کے ساتھ روشنی اچھالتے ہوں۔ میں ان کے قریب جا پہنچی۔ ان کی بالیوں پر انگلی پھیرنے ہی والی تھی کہ وہ مسکرا کر بولیں: ''ارے واہ، کتنی نٹ کھٹ بچی ہے! نام کیا ہے اس کا؟''

''شمیمہ، مگر سب اسے شمہ کہتے ہیں'' ممی نے جواب دیا۔

عورت ہنس پڑیں،

''کتنا پیارا نام ہے! اگر تم کہو تو میں اس شمہ کو اپنے بیٹے کے لیے چن لوں؟ ہمارے زمانے

میں تو مائیں بچپن میں ہی بہو چن لیا کرتی تھیں!'' سب عورتیں ہنسنے لگیں۔

میں شرما کر نیچے دیکھنے لگی، مگر دل میں ایک نرم سا خواب اتر گیا۔ میں نے ان کے کانوں کو دوبارہ دیکھا.... شاید وہ بالیاں کبھی میری بھی ہو جائیں۔ انہوں نے پیار سے میرے گال پر ہاتھ رکھا،

''شمہ بیٹا، تم بھی بڑی ہو کر ایسی ہی سونے کی بالیاں پہنو گی نا؟'' میں نے سر ہلا دیا۔ دل چاہا وہ ابھی اپنی بالیاں اتار کر مجھے دے دیں.... شام ڈھلی، ڈھول بجنے لگا۔ ناصر دلہن لے کر آیا۔

میں نے پہلی بار کسی دلہن کے چہرے پر اتنی روشنی دیکھی۔ اس کے کانوں میں بالیاں تھیں.... وہی چمک، وہی خواب، وہی جادو۔ رات بھر میں انہی خیالوں میں کھوئی رہی۔ خواب میں دیکھا.... وہی عورت، وہی بالیاں، اور ان کا بیٹا مجھے جھولے سے دھکا دیتا ہے۔ میں گرتی ہوں، خون نکلتا ہے، اور چیخ کے ساتھ آنکھ کھل جاتی ہے۔

وقت گزرتا گیا۔ میں بڑی ہوئی، مگر بالیاں کبھی نہ پہن سکی۔ ابو کی مزدوری سب بہنوں کی فیس میں چلی جاتی۔ میں خاموشی سے سلائی سیکھنے لگی۔ گاہے بگاہے شادیوں میں جاتی، عورتوں کے زیورات دیکھتی، مگر دل کے اندر ہمیشہ ایک خلا رہتا۔ پھر ایک دن، قسمت نے وہی خواب پورا کر دیا۔ اس عورت کا بیٹا رمضان.... اب جوان، خوش گفتار، اور خوش اخلاق.... ممی کے گھر رشتہ لے کر آیا۔ ''ہمیں شمہ پسند ہے۔'' میں ساکت رہ گئی۔ بچپن کا خواب جیسے زندہ ہو گیا۔ شادی سادگی سے ہوئی۔ ابو نے فخر سے میرا ماتھا چوما: ''آج میری بیٹی رانی بن گئی۔''

شادی کے دوسرے دن، ساس نے میرے کانوں میں سونے کی بالیاں پہناتے ہوئے کہا: ''یہ وہی ڈیزائن ہے جو تم نے برسوں پہلے زیبہ پھوپھی کی شادی میں دیکھا تھا۔'' میرے ہاتھ لرز گئے۔ کاش وہ جانتیں کہ میں نے ان بالیوں کو صرف زیور نہیں، ایک خواب

سمجھ کر دل میں بسایا تھا۔ میں نے کانچ کے آئینے میں خود کو دیکھا....

میری بالیاں سورج کی طرح چمک رہی تھیں، مگر اندر کہیں روشنی کم تھی۔ سال گزرتے گئے۔ رمضان سے ایک بیٹا، ایک بیٹی ہوئی۔ زندگی آہستہ آہستہ محبت کی مٹی سے بنی۔ رمضان شام کو دکان سے لوٹ کر بچوں کے لیے میٹھی چیزیں لاتا۔ گھر میں خوشبو بسی رہتی۔ پھر ایک دن وہی خوشبو زہر بن گئی۔ ناشتے کی دسترخوان پر رمضان کو چکر آیا، اور وہ زمین پر گر گیا۔

ڈاکٹر نے کہا: ''پھیپھڑوں میں شدید خرابی ہے... علاج مہنگا ہے۔ بیس، پچیس لاکھ لگیں گے۔''

میرے ہاتھ کانپ گئے۔ سونا، خواب، آس.... سب ایک لمحے میں بکھر گئے۔ میں نے رات بھر سوچا۔ پھر صبح الماری سے اپنے زیورات نکالے۔ ان میں وہ بالیاں بھی تھیں... وہی جن کے لیے میں نے بچپن سے سپنے دیکھے تھے۔ میں نے انہیں ہاتھوں پر رکھا، دیکھا، چمک دھندلا گئی تھی۔ سنار کے پاس جا کر سب بیچ دیے۔ پندرہ لاکھ ہاتھ آئے۔ سسرال نے باقی مدد کی۔ علاج ہوا۔ رمضان بچ گیا۔

کئی مہینوں بعد وہ ٹھیک ہو کر گھر لوٹا۔

ایک دن اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر پوچھا: ''شمہ، تمہارے کان خالی کیوں ہیں؟'' میں خاموش رہی۔ پھر مسکرا کر بولی: ''کچھ خواب ایسے ہوتے ہیں رمضان، جو تب زیادہ چمکتے ہیں جب ہم انہیں قربان کر دیتے ہیں۔'' رمضان نے میری طرف دیکھا.... آنکھوں میں شکر اور محبت تھی۔ میں نے محسوس کیا،

میرے کان خالی ضرور ہیں، مگر میرے دل میں بالیوں سے زیادہ قیمتی چمک ہے....

ایک عورت کی قربانی کی روشنی۔

☆☆

خوشیوں کا گہوارہ

موسم نہایت خوشگوار تھا۔اس سال اتفاق یہ ہوا کہ عیداور دیوالی ایک ہی دن آ رہی تھیں۔مسلمان اور ہندو ایک دوسرے کے ساتھ خوشیاں بانٹنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ میں بارڈر پر تعینات اپنی ڈیوٹی دے رہا تھا۔شام کے وقت ہم ایک دوسرے کے ساتھ والی بال کھیل رہے تھے۔یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم سب ایک ہی ماں کے بیٹے ہوں شام کے پانچ بجے دوستانہ میچ ختم ہونے پر ہم نے ایک دوسرے کو گلے لگایا اور اپنی اپنی بارکوں کی طرف لوٹنے لگے۔اسی وقت رام کمار نے پیچھے سے آواز دی ''سنتے ہو!اس سال ہم عیداور دیوالی ایک ساتھ منائیں گے۔مٹھائیاں ضرور لانا!'' میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا: ''ہاں ہاں ضرور لانا! مگر پچھلے سال والی سڑی ہوئی نہ ہو... ورنہ!'' رام کمار نے ہنستے ہوئے پوچھا: ''ورنہ کیا؟'' اور پھر ہم سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ایسا لگ رہا تھا کہ خوشیوں نے آج سے ہی ڈیرہ جمالیا ہے۔رات کے بارہ بج چکے تھے۔آدھے فوجی بارکوں میں سو رہے تھے اور آدھے سنتری ڈیوٹی پر تھے کہ اچانک دوسری جانب بنکر میں ایک خوفناک دھماکہ ہوا۔ہم فوراً باہر نکلے تو دیکھا کہ پاس کا بنکر مکمل تباہ ہو چکا تھا۔یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ گولہ کہاں سے آیا تھا۔اسی دوران آر پار گولہ باری شروع ہوگئی۔رات بھر فائرنگ ہوتی رہی۔جو خوشیاں کل ہی بارڈر پر اتری تھیں وہ لمحے بھر میں غم میں بدل گئیں۔زخمی سپاہی دونوں طرف درد سے کراہ رہے تھے،مگر کوئی انہیں پوچھنے والا نہ تھا۔میں بھی زخمی تھا لیکن اللہ کے کرم سے زیادہ نقصان

نہیں ہوا۔ صبح ہوئی تو دونوں طرف دھواں اور لاشوں کے ڈھیر موجود تھے۔ میں نے دوربین سے دیکھا تو دوسری جانب بھی تباہی ہی تباہی تھی۔ دل میں ایک ہی خیال تھا ''رام کمار کہاں ہوگا؟''

میں نے زور سے آواز دی: ''رام کماااار!'' مگر دوسری جانب سے آواز آئی: ''وہ کل بنکر میں شہید ہو گئے۔''

یہ سنتے ہی میرے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں ڈھیر ہو گیا۔

میرے کانوں میں بار بار رام کمار کی آواز گونج رہی تھی ''مٹھائیاں ضرور لانا......'' میں نے دوسری جانب بچے ہوئے فوجی سیتارام سے پوچھا کہ آخر یہ سب کیسے ہوا؟ اس نے افسردگی سے کہا: ''بھائی، ہمیں بھی نہیں معلوم۔ جو گولہ ہمارے بنکر پر گرا، اس نے سب کچھ تباہ کر دیا۔ پتہ نہیں وہ کہاں سے آیا۔ ہم نے ایک دوسرے پر نہیں چلایا... پھر یہ تباہی کیوں؟'' اسی لمحے دونوں طرف سے ہیلی کاپٹر اترا۔ آفیسر آئے، انہوں نے دیکھا، تصویریں لیں اور چلے گئے۔

سیتارام نے آہ بھری اور کہا: ''کیا ان کے چہروں پر ذرا سا بھی افسوس تھا؟'' میں خاموش تھا، کیونکہ جواب میرے پاس بھی نہیں تھا۔ ہم دونوں گلے لگ کر رو پڑے۔ میں نے دیکھا کہ سیتارام کی ٹانگ سے ابھی بھی خون بہہ رہا تھا۔ میں نے بیگ سے پٹیاں نکال کر اس کی مرہم پٹی کی۔ ہم اپنے اپنے سرحدی راستوں کی جانب بڑھنے لگے۔ کچھ قدم چل کر میں رک گیا۔

رام کمار کی یاد پھر سے دل میں چبھ گئی۔ میں واپس مڑا، اپنی گردن سے گرم مفلر اتارا اور سیتارام کے ہاتھ میں دے کر کہا:

''یہ رام کمار کی میت پر ڈال دینا... تاکہ اسے سردی نہ لگے.....''

میری آنکھوں سے آنسو چھلک گئے۔ واپس بارک کی طرف بڑھتے ہوئے میرے ذہن میں ایک ہی سوال گونج رہا تھا: رام کمار کے گھر والے کیسے دیوالی منائیں گے؟ اور اس کی چار سالہ بیٹی اپنے باپ کے بغیر کیسے رہے گی؟

وہی بیٹی جو فون پر مجھے ہمیشہ ''انکل'' کہہ کر بلاتی تھی....

میں بارک کے اندر چلا گیا تو دیکھا کہ بارک کے اندر سناٹا تھا، مگر ہر چہرے پر ایک ہی سوال لکھا تھا'' آخر کل رات ہوا کیا تھا؟'' اس کے بعد میرے ذہن میں یہی باتیں گردش کر رہی تھیں کہ سرحد کے دونوں طرف انسان رہتے ہیں جن کی خوشیاں، آنسو اور خواب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ مگر جنگ... جنگ سب کچھ چھین لیتی ہے مٹھائیاں، دیوالی، عید، زندگی، رشتے اور رام کمار جیسے دوست۔

☆☆

لڑائی

اکبر کا کا سارم گاؤں کا غریب کسان تھا۔ زندگی اس کے لیے بوجھ بن چکی تھی.... ایک ایسا بوجھ جو وہ ہر روز اپنے کندھوں پر اٹھائے کھیتوں میں پسینہ بہاتا تھا۔ زمین خشک تھی، فصلیں کمزور، مگر قرضوں کا بوجھ ہمیشہ گھاس کی طرح بڑھتا جاتا۔

اس کی بیوی مختی بیگم کبھی گاؤں کی حسین لڑکی کہلاتی تھی۔ مگر وقت نے اس کی آنکھوں کی چمک چرالی تھی۔ اب اس کے ہونٹوں پر شکایت، چہرے پر تھکن، اور دل میں خالی پن بسا ہوا تھا۔

وہ اکثر برتن دھوتے، کپڑے نچوڑتے نچوڑتے اپنے آپ سے باتیں کرتی۔

''خدا نے مجھے اسی دن کیوں نہ اٹھا لیا تھا جب میں پیدا ہوئی تھی... میری پڑوسن رفیقہ کو دیکھو، پانچ بچے ہیں مگر اب بھی ہنستی ہے، شوہر اس کے لیے بریانی لاتا ہے... اور میں؟ باسی روٹی پر زندہ ہوں۔''

اکبر کا کا یہ سب سنتا رہتا، مگر چپ۔ وہ جانتا تھا کہ غریبی صرف جسم کو نہیں، رشتوں کو بھی بھوکا رکھتی ہے۔

ایک دن مختی نے طیش میں کہا:

''پتہ نہیں میرے باپ کو کیا سوجھی کہ مجھے تم جیسے نکمے کے حوالے کیا۔ ورنہ میں....''

اکبر نے پلٹ کر پوچھا: ''ورنہ کیا؟ بولو ورنہ کیا؟''

''ورنہ کسی عزت والے گھر میں ہوتی... سانڈ جیسے شوہر کے ساتھ نہیں!''

یہ الفاظ اکبر کے دل پر نشتر کی طرح چلے۔ پہلے تو اس نے ضبط کیا، پھر ضبط ٹوٹ گیا۔ دو زوردار تھپڑوں کی گونج نے خاموشی چیر دی۔ مختی کی ایک چیخ فضا میں گونجی۔ ان کے پانچ سالہ بیٹے نے جب ماں کی چیخ سنی، بھاگتا ہوا باہر آیا۔

''ماں! بابا نے تمہیں کیوں مارا؟

بابا، آپ کیوں لڑتے ہیں روز؟

میرا دوست کہتا ہے کہ ہمارے گھر میں روز لڑائی ہوتی ہے...

بابا، یہ لڑائی کیا ہوتی ہے؟''

اکبر کا کا جیسے پتھر کا مجسمہ بن گیا۔ بیٹے کی آواز نے اس کے اندر کچھ پگھلا دیا۔ وہ بنا کچھ کہے پھاوڑا کندھے پر رکھ کر گھر سے نکل گیا۔

شام ڈھل گئی۔

دھوپ کی آخری کرنیں گاؤں کے کھیتوں پر پھیل رہی تھیں۔ اکبر چنار کے نیچے بیٹھا سوچتا رہا....

''میں نے آخر کیا پایا؟ غربت، گالی، اور اب ایک بچہ جو پوچھتا ہے کہ لڑائی کیا ہوتی ہے...''

جب گھر لوٹا، تو مختی دروازے پر بیٹھی سڑک کی طرف تک رہی تھی۔

بیٹے نے خوشی سے کہا: ''ماں، دیکھو بابا آ گئے!''

اکبر نے کچھ نہیں کہا، پھاوڑا رکھ کر کھڑکی کے پاس جا بیٹھا۔ مختی تھوڑی دیر بعد پلیٹ میں روٹیاں اور چائے لے آئی۔ ''چائے پیو...'' وہ آہستہ سے بولی۔ ''بھوک نہیں ہے...''

''پیو نا، تمہیں میری قسم...''

اکبر نے دیکھا، اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ''پہلے یہ تھرتھراہٹ تو دور کرو...'' یہ سن کر مختی

کے چہرے پر ہلکی سی ہنسی پھیل گئی۔ چائے کا پیالہ ہاتھ سے چھوٹا، فرش پر گرا، اور لمحے بھر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر دونوں ہنس پڑے.... ایک ایسی ہنسی جس میں رونے کی تھکن بھی تھی، اور جینے کی خواہش بھی۔

بیٹے نے حیرت سے پوچھا:

''ماں، بابا، کیا اسی کو لڑائی کہتے ہیں؟''

اکبر اور مختی نے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر بیٹے کو گود میں اٹھا کر کہا: ''نہیں بیٹے، یہ لڑائی نہیں.... یہ زندگی ہے۔ کبھی روتی ہے، کبھی ہنستی ہے۔'' باہر بارش ہونے لگی تھی۔

چولہے پر روٹیاں پک رہی تھیں۔

اور اس رات، کئی دنوں بعد، اکبر کاکا اور مختی بیگم نے ایک ہی تھالی میں روٹی کھائی، ایک ہی پیالے سے چائے پی۔ ان کے بیٹے نے مسکرا کر دیکھا.... اور اس کی مسکراہٹ میں ساری لڑائیاں گھل گئیں۔

☆☆

سایہ

صبح کے وقت گاؤں کے راستوں پر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔گلی کے ایک کونے سے شمیمہ تیزی سے چلتی ہوئی آ رہی تھی۔اس کی آنکھوں میں پریشانی اور قدموں میں لچک نہ تھی، جیسے ہر قدم اٹھانا ایک بوجھ ہو۔اس کے بازوؤں میں دبلا پتلا سا بچہ، ظفر، بے جان سا پڑا تھا۔اس کی سانسیں کمزور تھیں، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور ہونٹ سوکھ کر کسی پتے کی طرح سکڑ چکے تھے۔

شمیمہ پیر بابا کے ڈیرے پر پہنچی۔ وہاں عورتوں اور مردوں کی لمبی قطار لگی تھی۔ڈھول کی ہلکی تھپ تھپ، مہندی اور لوبان کی بو اور لوگوں کی سرگوشیاں ماحول کو اور بھی پراسرار بنا رہی تھیں۔

''بابا جی! میرا بچہ کئی دن سے کچھ کھاتا پیتا نہیں... بس پیٹ میں مروڑیں اٹھتی ہیں... میں کیا کروں؟''

شمیمہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

پیر بابا نے اپنی نیم بند آنکھیں اٹھائیں، ہونٹوں پر کچھ بڑبڑایا اور ایک دم زور سے بولے:

''اللہ ھو... اللہ ھو... اس پر سایہ ہے! بڑی بھوتنی کا سایہ!''

فوراً ہی مجمع میں ہلچل مچ گئی۔ کچھ عورتوں نے ڈر کے مارے چہرے چھپا لیے، کچھ زیرلب الحمداللہ پڑھنے لگیں۔شمیمہ کے دل پر جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا۔وہ سہم کر رہ گئی۔آنسو پلکوں میں اٹک کر باہر ٹپکنے کو بیتاب تھے۔

ظفر اپنی آدھی کھلی آنکھوں سے لوگوں کے چہروں کو دیکھ رہا تھا.... معصومیت سے، حیرت سے۔ جیسے بے زبان آنکھیں کہہ رہی ہوں:

''میں بیمار ہوں... سایہ زدہ نہیں!''

ایک عورت جو شمیمہ کے برابر میں بیٹھی تھی، رفتہ رفتہ قریب ہوئی اور بولی:

''بہن! اس بچے کو کسی ڈاکٹر کے پاس بھی لے کر جائے، شاید یہ کوئی بیماری ہو...''

شمیمہ نے تاؤ میں جواب دیا:

''مشورے دینے آجاتی ہیں سب! بابا جی نے کہا ہے نا کہ اس پر سایہ ہے... تو بس سایہ ہے!''

عورت نے ضبط کے ساتھ کہا:

''میں تمہاری دشمن نہیں... مگر اس کے پیلے چہرے کو دیکھو، نحیف جسم کو دیکھو، اس کی نبض کمزور ہے... یہ بیمار ہے، بدروح زدہ نہیں!''

جواب میں شمیمہ نے بچے کو زور سے اپنی چھاتی سے لگالیا اور چیخی:

''بھوتنی اس کو چھوڑ دے! اسے مت ستا!''

پیر بابا نے اپنے ہاتھ اسی کی آواز پر اٹھائے اور تین لمبی پھونکیں ماریں۔ پھر اچانک ظفر کی پیٹھ پر زور سے دو تھپڑ مارے۔ ظفر گھبراہٹ سے کانپ اٹھا اور ہلکی کراہ کی آواز نکلی۔

پیر بابا بولے:

''اب ٹھیک ہو جائے گا۔ لے جاؤ اسے۔'' شمیمہ نے سجدے جیسے انداز میں پیر بابا کے پاؤں چھوئے اور بچے کو لے کر باہر آگئی۔ مگر وہ باہر قدم رکھتے ہی بے بسی سے رونے لگی۔

یہ سلسلہ دنوں سے مہینوں میں بدل گیا۔ ظفر کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ کمزوری بڑھتی گئی۔ بھوک ختم ہوگئی۔ بدن سوکھ کر ڈھانچہ سا رہ گیا۔ اس کا باپ، لال دین، اندر ہی اندر ٹوٹ رہا تھا مگر شمیمہ سرے سے بات سننے پر آمادہ نہ تھی۔

محلے کے لوگ کہتے:

''ڈاکٹر کو دکھاؤ!''

مگر شمیمہ کا ایک ہی جواب ہوتا:

''یہ دوا کا نہیں، دعاؤں کا معاملہ ہے!''

اسی دوران اعلان ہوا کہ شہری ڈاکٹروں کی ایک ٹیم گاؤں بیگا پور میں مفت علاج کے لیے آ رہی ہے۔ محلے کا ایک نوجوان، کامران، شمیمہ کے گھر گیا اور اس کے شوہر سے بولا:

''بھائی! بچے کو کل وہاں لے چلو... زبردستی نہ سہی، پر کم از کم دکھ تو لیں۔''

رات بھر شمیمہ اور لال دین کے بیچ بحث چلتی رہی۔

لال دین بولا:

''میں اسے ڈاکٹروں کے پاس لے کر جاؤں گا۔''

شمیمہ چیخی:

''تم میری بات نہیں مانتے؟ بابا کہتے ہیں اس پر سایہ ہے!''

اگلے دن کامران گھر آیا اور نہ جانے کیا الفاظ استعمال کیے کہ شمیمہ آخر کار مان گئی۔

وہ ظفر کو اٹھا کر ڈاکٹر کے سامنے لے آئے۔ ڈاکٹر نے ننھے وجود کی نبض پکڑی۔ کچھ دیر خاموش رہے، پھر گہری سانس لی اور شمیمہ سے پوچھا:

''آپ اس کی کیا لگتی ہیں؟''

''میں اس کی ماں ہوں۔''

ڈاکٹر نے میز پر رکھا قلم مضبوطی سے دبایا، جیسے غصے کو قابو میں لے رہا ہو:

''اس کا علاج ابھی تک کیوں نہیں کروایا؟''

شمیمہ نے گردن اکڑاتے ہوئے کہا:

''کروایا تو ہے... بابا شمس، سنیاسی رام داس، پیر احمد... اتنے تعویذ ہیں اس کے پاس...

دیکھیں!"

اس نے ظفر کی قمیص اٹھائی۔ گلے میں تعویذوں کی لمبی زنجیر لٹک رہی تھی۔

ڈاکٹر کی آنکھیں غصے سے سرخ ہوگئیں۔

"بس! Enough!"

"اسی اندھی عقیدت نے اسے مار دیا! دونوں گردے ناکارہ ہو چکے ہیں۔ اگر دو مہینے پہلے آجاتے تو بچ جاتا۔ اب 40 فیصد چانس ہے... اگر گردہ مل جائے تو..."

زمین جیسے جھول گئی۔

شمیمہ کی چیخ آسمان چیرنے لگی:

"میں پاگل تھی! میں اندھی تھی! میں نے کسی کی نہ سنی... میرا بچہ... میرا بچہ..."

گھر میں فیصلہ ہوا کہ گردہ کون دے گا۔ رات بھر بحث ہوتی رہی۔ آخر ماں نے فیصلہ کیا:

"میں دوں گی... میں!"

اس رات ہر سانس بھاری ہوگئی۔ اندھیرا طویل ہوتا گیا۔ بارہ بج کر تین منٹ پر اچانک شمیمہ کے گھر سے دل دہلا دینے والی چیخیں اٹھیں۔

پورا محلّہ دیوانہ وار دوڑا۔

اندر ظفر خاموش لیٹا تھا... سانس رکی ہوئی... چہرے پر عجیب سی سکون بھری مسکراہٹ۔

تخت کے پاس کھڑے جید بزرگ نے آہ بھر کر اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور بولے:

"قَالُوا اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ راجعون"

شمیمہ زمین پر گر گئی۔ اس کی ہچکیوں میں ایک آخری جملہ کانوں میں گونج رہا تھا:

"بھوتنی میرے بچے پر نہیں تھی... میرے دماغ پر تھی..."

☆☆

محلے کے لوگ کہتے:

''ڈاکٹر کو دکھاؤ!''

مگر شمیمہ کا ایک ہی جواب ہوتا:

''یہ دوا کا نہیں، دعاؤں کا معاملہ ہے!''

اسی دوران اعلان ہوا کہ شہری ڈاکٹروں کی ایک ٹیم گاؤں بیگا پور میں مفت علاج کے لیے آ رہی ہے۔ محلے کا ایک نوجوان، کامران، شمیمہ کے گھر گیا اور اس کے شوہر سے بولا:

''بھائی! بچے کو کل وہاں لے چلو... زبردستی نہ سہی، پر کم از کم دیکھ تو لیں۔''

رات بھر شمیمہ اور لال دین کے بیچ بحث چلتی رہی۔

لال دین بولا:

''میں اسے ڈاکٹروں کے پاس لے کر جاؤں گا۔''

شمیمہ چیخی:

''تم میری بات نہیں مانتے؟ بابا کہتے ہیں اس پر سایہ ہے!''

اگلے دن کامران گھر آیا اور نہ جانے کیا الفاظ استعمال کیے کہ شمیمہ آخر کار مان گئی۔

وہ ظفر کو اٹھا کر ڈاکٹر کے سامنے لے آئے۔ ڈاکٹر نے ننھے وجود کی نبض پکڑی۔ کچھ دیر خاموش رہے، پھر گہری سانس لی اور شمیمہ سے پوچھا:

''آپ اس کی کیا لگتی ہیں؟''

''میں اس کی ماں ہوں۔''

ڈاکٹر نے میز پر رکھا قلم مضبوطی سے دبایا، جیسے غصے کو قابو میں لے رہا ہو:

''اس کا علاج ابھی تک کیوں نہیں کروایا؟''

شمیمہ نے گردن اکڑاتے ہوئے کہا:

''کروایا تو ہے... بابا شمس، سنیاسی رام داس، پیر احمد... اتنے تعویذ ہیں اس کے پاس...

دیکھیں!''

اس نے ظفر کی قمیص اٹھائی۔ گلے میں تعویذوں کی لمبی زنجیر لٹک رہی تھی۔

ڈاکٹر کی آنکھیں غصے سے سرخ ہوگئیں۔

''بس Enough!!''

''اسی اندھی عقیدت نے اسے مار دیا! دونوں گردے ناکارہ ہو چکے ہیں۔ اگر دو مہینے پہلے آجاتے تو بچ جاتا۔ اب 40 فیصد چانس ہے... اگر گردہ مل جائے تو...''

زمین جیسے جھول گئی۔

شمیمہ کی چیخ آسمان چیرنے لگی:

''میں پاگل تھی! میں اندھی تھی! میں نے کسی کی نہ سنی... میرا بچہ... میرا بچہ...''

گھر میں فیصلہ ہوا کہ گردہ کون دے گا۔ رات بھر بحث ہوتی رہی۔ آخر ماں نے فیصلہ کیا:

''میں دوں گی... میں!''

اس رات ہر سانس بھاری ہوگئی۔ اندھیرا طویل ہوتا گیا۔ بارہ بج کر تیس منٹ پر اچانک شمیمہ کے گھر سے دل دہلا دینے والی چیخیں اٹھیں۔

پورا محلّہ دیوانہ وار دوڑا۔

اندر ظفر خاموش لیٹا تھا... سانس رکی ہوئی... چہرے پر عجیب سی سکون بھری مسکراہٹ۔

تخت کے پاس کھڑے جید بزرگ نے آہ بھر کر اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور بولے:

''قَالُوا اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ راجعون''

شمیمہ زمین پر گر گئی۔ اس کی ہچکیوں میں ایک آخری جملہ کانوں میں گونج رہا تھا:

''بھوتنی میرے بچے پر نہیں تھی... میرے دماغ پر تھی...''

☆☆

واردات

''آیئے آیئے ــــ چھلہ رام! کیسا آنا ہوا؟''

گاؤں کے چوہدری دین دیال چارپائی پر بیٹھا حقہ کے کش لگا رہا تھا۔ اس کے اردگرد دو چار لوگ بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔

چُھلہ رام آتے ہی دوزانو بیٹھ گیا۔

''نمسکار چوہدری صاحب!'' اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''ہاں بھئی، سیدھی بات کرو... کیا کہنا ہے؟''

''چوہدری صاحب... وہ سُمر داس... جو میرا ہمسایہ ہے....''

''ہاں ہاں، ہوا کیا سُمر داس کو؟''

''اسے کچھ نہیں ہوا... مگر وہ میرے خلاف کورٹ میں گواہی دینے والا ہے۔ کہ بنجر کی زمین میری نہیں بلکہ آتمارام کی ہے... کیونکہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔''

یہ بنجر ایک کنال زمین تھی جس پر کئی دہائیوں سے چھلہ رام اور آتمارام کے درمیان مقدمہ جاری تھا۔ اصل زمین آتمارام کی تھی، مگر آتمارام کے والد کے انتقال کے بعد، جب آتمارام کی عمر صرف پانچ سال کی تھی، چُھلہ رام نے اس کی بے بسی کا فائدہ اٹھا کر قبضہ کرلیا تھا۔ پہلے گاؤں سب جانتا تھا، مگر وقت گزرنے کے ساتھ نئی پیڑی بیخبر ہوگئی۔

چوہدری کو بھی اپنے باپ سے سنا تھا کہ زمین آتمارام کی ہے، مگر چُھلہ رام کا پہنچنا اس کے

لیے دلچسپی کا سبب تھا۔ اس نے سوچا۔ آج سُمر داس کے خلاف ایک اور ہتھیار ہاتھ لگا ہے... ایک تیر سے دو شکار!

چند ماہ پہلے چوہدری اور سُمر داس میں سخت جھگڑا ہوا تھا۔ ہوا یوں کہ سمر داس کے بیٹے کو چوہدری کی بیٹی سے محبت ہوگئی تھی۔ وہ رشتہ لے کر ان کے گھر گیا تو چوہدری کے چمچوں نے اسے دھکے دے کر نکال دیا۔ تب سے چوہدری نے اسے برباد کرنے کی قسم کھالی تھی۔

مگر گاؤں میں سرگوشیاں تھیں کہ چوہدری کی بیٹی آتمارام کی بیٹی کی مدد سے گھر سے بھاگ گئی۔ چوہدری کا ایک ہی بیٹا تھا.... لیکن بہرا اور ہکلا۔ وہ ہر قیمت پر اس کی شادی آتمارام کی پڑھ لکھی بیٹی سے کرانا چاہتا تھا، مگر اس نے کئی بار کہہ کر انکار کیا تھا:

''میں پڑھی لکھی ہوں... اور چوہدری کا بیٹا ان پڑھ اور گنوار!''

''چوہدری صاحب!'' چھلہ رام بے چین ہو کر بولا، ''آپ کے پاس سفارش ہے، آپ مجھے ان دونوں کے چنگل سے آزاد کروادیں۔''

چوہدری نے گہرا کش لیا۔

''مگر میں نے تو اپنے باپ سے سنا ہے کہ وہ زمین آتمارام کی ہے۔''

''چوہدری صاحب... وہ تو ہے، مگر!!!''

''ارے پگلے.... مگر کیا؟''

اس نے باقی سب لوگوں کو اشارہ کیا کہ ایک طرف ہو جائیں۔ لوگ اٹھ کر چلے گئے۔ چوہدری نے جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا۔ بات سن کر چھلہ رام کانپ اٹھا۔

''میرا ضمیر یہ اجازت نہیں دیتا!'' وہ زور سے چیخا۔

''سوچ لے چھلہ رام... ورنہ....''

چھلہ رام گھر گیا تو ساری رات خود سے لڑتا رہا....

''نہیں! میں ایسا نہیں کروں گا۔''

مگر لالچ، خوف اور زمین کی ہوس نے اسے آخر کار جھکا دیا۔ صبح وہ چوہدری کے گھر پہنچا۔

''میں وہی کروں گا جو آپ کہیں گے... بس تاریخ یاد رکھئے ...چوبیس جون۔'' ہاں چوبیس جون .....

10 مئی کی صبح گاؤں میں بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ گھروں سے دوڑتے نکل رہے تھے۔ چوہدری اپنی گدی پر بیٹھا ہے کہ نوکر پریشان حال اندر آیا:

''چو... چو... چوہدری صاحب! غضب ہو گیا!''

''کیا ہوا؟''

''چوہدری صاحب — آپ کے سمدھی جی سُمر داس کا قتل ہو گیا!''

چوہدری نے گہری سانس لی۔

''ہا! میں سمجھا کوئی آفت آ گئی... یہ تو بھلا ہو گیا!''

''نہیں چوہدری صاحب — بھلا نہیں، مصیبت آن پڑی ہے... قتل کا الزام آپ پر لگا ہے!''

''کیسا الزام؟''

''جہاں سُمر داس کی لاش ملی، وہیں سے چُھلہ رام کا آدھار ملا۔ اور جانچ میں چھلہ رام نے قتل قبول کر لیا اور بتایا کہ یہ سب آپ کے کہنے پر ہوا...''

اسی لمحے پولیس پہنچی۔

''چوہدری دین دیال.... یو آر انڈر اَریسٹ!''

ایک ہی ہتھکڑی میں چوہدری اور چھلہ رام بندھے کھڑے تھے، اور ایک دوسرے کو گھور کر کہہ رہے تھے:

''یہ واردات تمہاری وجہ سے ہوئی!''

چوبیس جون......دونوں کورٹ کی کچہری میں تھے... مگر زمین کے فیصلے کے لیے نہیں بلکہ اپنے جرم کی سزا کے اعلان کے لیے۔

اور جج نے دونوں کو عمر قید کی سزا سنائی۔

دوسری طرف سُمر داس کا بیٹا اور چوہدری کی بیٹی، چوہدری کے ہی محل نما گھر میں آ بسے۔

اور کاغذات کی بنیاد پر عدالت نے آتما رام کو اس کی بنجر کی ایک کنال زمین واپس دلا دی۔

☆☆

توبہ قبول ہوئی

ہمارا گاؤں چھوٹا سا مگر محبتوں سے بھرا ہوا تھا۔ شام ڈھلے جب سورج پہاڑیوں کے پیچھے چھپ جاتا اور کھیتوں میں سنہری روشنی بکھر جاتی تو ہم سارے بچے گلیوں میں کھیلنے نکل پڑتے۔ انہی دنوں بچپن کی شرارتوں میں میرا سب سے قریبی ساتھی شاہد تھا۔ ہم ایک دوسرے کے بغیر ادھورے تھے— کھیل میں، اسکول میں، اور خوابوں میں بھی۔

مگر شاہد کے اندر ایک اندھیری دراڑ تھی۔ اسے چیزیں چرانے کی عادت تھی۔ کبھی وہ کسی کی نئی پنسل جیب میں ڈال لیتا، کبھی دکان سے ٹافی اٹھا لیتا۔ جب کوئی پکڑ لیتا تو کہتا: ''چھوٹی سی بات ہے، سب کرتے ہیں!''

استاد نے ایک دن اس کے والدین سے شکایت کی۔ مگر انہوں نے غصے سے جواب دیا: ''ہمارا شاہد کچھ بھی کر سکتا ہے پر چوری نہیں! ہم غریب ضرور ہیں مگر عزت دار ہیں!''

لیکن ہم جانتے تھے کہ عادتیں کبھی خود نہیں مرتیں، وقت کے ساتھ طاقتور ہو جاتی ہیں۔

وقت گزرتا گیا اور شاہد کی خواہشیں بڑھتی گئیں۔ اب وہ کاپیاں بیچ کر سگریٹ خریدتا۔ کبھی دکان کا پیسہ اڑا لیتا۔ میں نے اسے لاکھ سمجھایا مگر ایک دن اس نے غرور سے کہا: ''یار! دنیا والوں کے پاس بہت دولت ہے۔ اس میں ہمارا حصہ کیوں نہ ہو؟ قسمت بہادروں کا ساتھ دیتی ہے!''

میں نے سخت لہجے میں کہا: ''یہ بہادری نہیں بدبختی ہے۔ رزقِ حلال کھاؤ، نہ کہ چوری کی

روٹی!"

وہ بھڑک اٹھا۔اچانک اس کے ہاتھ کا زور میرے گال پر پڑا.... زوردار تھپڑ۔

ہماری دوستی ختم ہوگئی۔

وہ گھر پہنچا تو والدین اس سے سختی سے پیش آئے، مگر شاہد ضد پر اڑ گیا۔آخر کار باپ نے دل پر پتھر رکھ کر اعلان کیا: "آج سے یہ ہمارا بیٹا نہیں! ہم اسے جائیداد سے عاق کرتے ہیں!"

شاہد اسی رات گھر چھوڑ کر گاؤں سے رخصت ہوگیا، بنا وداع کے۔اس کے بعد برسوں تک اس کا کوئی پتا نہ چلا۔لوگوں نے اندازہ لگایا کہ شاید وہ چوری کے کسی جرم میں مارا گیا ہوگا۔

ایک شام میں شہر میں تھا کہ اچانک چیخ و پکار سنائی دی۔ایک تیز رفتار ٹرک نے ایک آدمی کو کچل دیا تھا۔لوگ اسے اسپتال لے جا رہے تھے۔جب میں نے اس کا چہرہ دیکھا تو میرے قدم لرز گئے.... وہ شاہد تھا۔

اسپتال میں کئی ماہ علاج چلتا رہا۔جب ایک دن اس نے آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں ناقابلِ بیان شرمندگی تھی۔اس کی آواز ریت کی طرح کھردری تھی:

"میں شہر پہنچ کر غلط لوگوں کے چنگل میں پھنس گیا۔شروع میں جیبیں کاٹیں، پھر گھروں میں چوریاں... نشہ میری رگوں میں زہر بن کر اتر گیا۔"

اس نے تھوک نگلا اور بولا:

"ایک رات میں قبرستان گیا۔وہاں لوگوں کا گروہ کفن چوری کا دھندا کر رہا تھا۔پیسے ملتے تھے... حرام کے، مگر میری سزا کے۔"

کمرے میں خاموشی پھیل گئی۔شاہد کی آواز کپکپانے لگی:

"میں نے ایک بزرگ کی قبر کھودی۔جیسے ہی کفن کھولنے لگا وہ زندہ ہو گئے! انہوں نے میری کلائی تھام کر کہا: "بدبخت انسان! مردوں کو بھی نہ چھوڑا؟ کل تیرا کفن کون چھوڑے گا؟"

میں نے سہم کر پوچھا: ''پھر کیا ہوا؟''

وہ پھوٹ کر رو پڑا: ''میں بھاگا... اور اسی رات خواب میں وہی بزرگ مجھے مسجد لے گئے۔ سامنے نورانی چہرے، سفید لباس... صرف میرا چہرہ کالا، کوئلے کی طرح جلتا ہوا۔ بزرگ نے کہا: ہر گناہ کا حساب دینا ہوگا۔ اگر توبہ نہ کی تو تیرا انجام سب سے برا ہوگا'' میں نے روتے روتے کہا: مجھے بچالو!

انہوں نے فرمایا: ''سچے دل سے توبہ کر لے، اللہ مہربان ہے۔''

شاہد کا سانس پھول رہا تھا۔ ''میں چیخ مار کر اٹھا اور سجدے میں گر گیا۔ کہا: یا اللہ! مجھے معاف کر دے!''

اس نے آخر میں کہا: ''لوگ مجھے اب بھی چور سمجھتے ہیں، ان کی نظروں سے بچتے ہوئے ہی حادثہ ہوا تھا۔ مگر اب میں وہ شاہد نہیں رہا۔''

جب وہ گاؤں لوٹا تو پورا گاؤں جمع ہو گیا۔ ماں نے روتے روتے اسے گلے لگا لیا: ''بیٹا! ہمیں چھوڑ کر کہیں مت جانا۔''

شاہد نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا: ''اللہ! میری توبہ قبول فرما۔''

اس دن کے بعد وہ محنت مزدوری کرنے لگا، مسجد میں بیٹھ کر نوجوانوں کو نصیحت کرتا:

''گناہ آسان ہے...... مگر اس کا انجام جہنم ہے۔ محنت مشکل ہے...... مگر اس کا پھل عزت ہے۔''

اور پھر کہتا: ''اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہونا — وہ گناہگاروں کو بھی معاف کرتا ہے۔''

☆☆

بموں کی کہانی

عید کا موسم تھا۔ بازاروں میں غیر معمولی چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔ رنگ برنگی روشنیوں سے سجے بازار، عورتوں کی آوازیں، بچوں کی کلکاریاں، گاڑیوں کا بے ہنگم شور...... ہر شے جشن کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ لوگ نئے ملبوسات خریدنے میں مصروف تھے۔ میں بھی انہی لوگوں کے ہجوم میں گم تھا، اور اس رونق کو دیکھ کر دل خوش ہو رہا تھا۔

چلتے چلتے میرے قدم بس اڈے تک پہنچ گئے۔ یہاں بھی گہما گہمی جاری تھی۔ مسافر اپنی اپنی منازل کی سمت جانے والی گاڑیوں کی تلاش میں تھے۔ ایک طرف کونے میں ٹھیلے والے نے سنترے سجا رکھے تھے۔ میں نے سوچا کچھ سنترے خرید کر پیاس بجھاؤں۔ ابھی میں نے اس طرف قدم ہی بڑھایا تھا کہ اچانک ایک ہولناک دھماکے نے پورے ماحول کو چیر کر رکھ دیا۔

دھماکہ اتنا شدید تھا کہ قریب کھڑی گاڑیوں کے شیشے چکنا چور ہو گئے، در و دیوار دھڑ دھڑا کر لرز اٹھے۔ ایک لمحے میں ہر طرف گھنا دھواں پھیل گیا۔ میں دھماکے کی شدت سے زمین پر جا گرا اور زخمی ہو گیا۔ جب ہوش سنبھالا تو میرے اردگرد لاشوں کے انبار تھے۔ زخمی لوگ تڑپ رہے تھے، چیخیں فضا کو چیر رہی تھیں۔ بھاگتے ہوئے لوگ زخمیوں کے جسم روندتے ہوئے گزر رہے تھے۔

انہی لاشوں کے درمیان دھماکے کے تباہ شدہ پُرزے بکھرے پڑے تھے...... یوں لگتا تھا جیسے وہ اس قیامت خیز تباہی پر جشن منا رہے ہوں۔

''دیکھو! کتنی لاشیں بچھائی ہیں ہم نے!''

ایک پُرزہ طنزیہ قہقہہ لگا کر پکارا۔

مجھے غصے اور درد نے لرزا دیا۔ میں کراہتے ہوئے بولا:

''کم بختو! تمہیں خبر ہے کہ تم نے کتنی ماؤں کی گودیں اجاڑ دیں؟ کتنے بچوں کو یتیم کر دیا؟ کتنی عورتوں کا سہاگ چھین لیا؟''

لیکن میری آواز اس دھوئیں اور چیخوں کے شور میں کہیں دب گئی۔ وہ پرزے اپنی شیطانی مسرت میں مست باتیں کیے جا رہے تھے۔

اسی دوران کچھ باریک ذرات جو خون میں سر سے پاؤں تک بھیگ چکے تھے، سسکتے ہوئے بولے:

''ہم تو بڑے سکون سے سوئے ہوئے تھے۔ تم نے ہمیں بھی جگا دیا اور خون میں نہلا دیا۔ دیکھو ہمارا کالا رنگ سرخ ہو گیا۔ اس میں ہمارا بھی حصہ ہے۔''

ان کی معصومیت اور دکھ سے میرا دل پھٹنے لگا۔

پھر ایک چھوٹے ذرے نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا:

''کیا تمہیں ذرا بھی رحم نہیں آیا کہ اتنے بے گناہوں کو مار ڈالا؟''

اس سوال پر ایک بڑا پرزہ غصے سے گرج اٹھا:

''اپنی اوقات میں رہو! ایسے سوال کرنا چھوڑ دو۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے!''

مگر دوسرے ذرے نے ہمت کر کے کہا:

''میرے بھائی نے جو پوچھا ہے اُس کا جواب دو!''

اسی وقت ایک پرزہ دھیمی آواز میں بولا:

''ہم بھی لاچار ہیں۔ ہمیں بھی ترس آتا ہے۔ دیکھو ہماری آنکھوں میں بھی آنسو ہیں۔ مگر ہم کیا کریں؟ ہم تو اُن ہاتھوں کے اسیر ہیں جنھوں نے ہمیں بنایا۔ ہم کسی سے دشمنی نہیں رکھتے۔ اصل دشمنی انسانوں کی ہے۔ مشرق و مغرب، عرب و عجم، ہندو مسلمان کے نام پر۔ یہ اپنی ہوس، اپنی زمین، اپنے مفاد کے لئے خون کی ندیاں بہاتے ہیں۔ ہم تو بس اُن کے اشاروں پر چلتے ہیں۔''

اس نے ایک لاش کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو ایک عورت کی لاش پڑی تھی، جس کی گود میں سات آٹھ ماہ کا بچہ چمٹا ہوا تھا۔ دونوں بے جان تھے۔ بچہ ماں کے سینے سے یوں لگا ہوا تھا جیسے ابھی بھی دودھ مانگ رہا ہو۔ اُس کی نیم وا آنکھیں چپ چاپ فضا سے سوال کر رہی تھیں:

''میرا قصور کیا تھا؟''

میرا کلیجہ دہل گیا۔

پھر ایک اور پرزہ روتے ہوئے بولا:

''اگر کسی مغربی ملک کا بنایا ہوا بم مشرقی کے پاس ہو یا مسلمان کا بنایا ہوا ہندو کے پاس۔ ہم کبھی لڑائی نہیں کریں گے۔ ہم آپس میں بھائی ہیں۔ ہمیں نہ لالچ ہے نہ نفرت۔ ہمیں بس حکم دیا جاتا ہے اور ہم چل پڑتے ہیں۔ نقصان ہمارا نہیں، انسان کا ہوتا ہے۔''

اتنے میں کچھ لوگ آئے اور لاشیں گنی شروع کیں۔

''ایک......دو......تین... چار''......

گنتی کرتے کرتے تیس لاشوں پر گنتی رُکی۔

مجھے زخمیوں کی ایمبولنس میں ڈال دیا گیا۔

لیکن افسوس...... کسی بھی شخص کی زبان پر امن کا ایک لفظ تک نہ تھا۔

ہر کوئی صرف بدلے کی بات کر رہا تھا۔

☆☆

بند کمرہ

چاندنی رات تھی۔ آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے اور بہار کی نرم ہوا زمین کو چوم رہی تھی۔ شبنم کے قطرے چاند کی روشنی میں یوں چمک رہے تھے جیسے کسی نے زمین پر لعل و جواہرات بکھیر دیے ہوں۔ پوری وادی میں گہری خاموشی کا راج تھا.... ایسی خاموشی جو دل کی دھڑکن تک سنائی دے۔

مشرق کی سمت سیاہ بادل آہستہ آہستہ چڑھ رہے تھے اور میں اپنی جھونپڑی کی کھڑکی سے یہ سب دیکھتے ہوئے عجیب سی تسکین محسوس کر رہا تھا۔ فطرت مجھے اپنی گود میں چھپائے بیٹھی تھی۔ وقت رُکا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ نیند میری پلکوں پر اترنے لگی۔ میں نے کھڑکی بند کی، بستر پر لیٹا اور سکون کی سانس لی۔

مگر اچانک.... ایک نسوانی آواز......نرم، لطیف، اور ایسی گونج والی جیسے کسی اور جہان سے آ رہی ہو۔ ''اٹھو......''

میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ آواز بار بار میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ کسی انجانی کشش کے زیر اثر میں دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

رات کی ہوا نم تھی، تاریکی گہری ہو رہی تھی اور صحرا کی سمت سے ایک سریلا گیت ابھر رہا تھا......آواز لطیف تھی مگر دل کو چیرنے والی۔

میں حیران تھا۔ کیا اس ویران صحرا میں کوئی ہے؟ یہاں تو صدیوں سے کوئی بستی نہیں! گانا

آہستہ آہستہ بلند ہوتا گیا اور پھر کسی نے پکارا: ''آؤ......آگے آؤ......''

میرے قدم بے اختیار چلنے لگے۔ خوف اور کشش ایک ساتھ دل پر طاری تھے۔

اچانک دور سے روشنی ابھری۔ آہستہ آہستہ ایک دوشیزہ ظاہر ہوئی.... ہاتھ میں شمع، بال ہوا میں بکھرے، بادامی آنکھیں سمندر کی گہرائی جیسی۔

میں لرزتی آواز میں بولا: ''تم......کون ہو؟''

وہ ہنسی.... ایسی ہنسی جیسے پگھلا ہوا چاند۔ ''تم نے مجھے نہیں پہچانا؟'' میں خاموش رہا۔ بادلوں نے چاند چھپا لیا، موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ میں پلٹ کر بھاگنے لگا مگر اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''ڈرو مت......میرے ساتھ چلو۔''

میں نہیں جانتا تھا میں کیوں چل رہا ہوں، مگر چلتا گیا۔

تھکن بڑھتی گئی، سردی ہڈیوں میں اتر گئی۔ وہ رکی، آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر چند الفاظ بڑبڑائی اور اس کے ہاتھ میں گرم کوٹ نمودار ہوا۔

''یہ پہن لو......''

میں حیرت زدہ کھڑا تھا مگر خاموشی سے کوٹ پہن لیا۔

تاریکی اور بارش کے بیچ ہم چلتے رہے اور آخر دور ایک حویلی ابھری.... چاند کی طرح چمکتی ہوئی، روشنیوں سے بھری، جیسے کسی اور زمانے کی ہو۔ اندر سے گیتوں کی آوازیں آ رہی تھیں، ایسی آوازیں جو دل کی جڑوں تک اتر جائیں۔

دروازے کے دونوں طرف حسین لڑکیوں کی قطار تھی، ہاتھوں میں شمعیں اور پھول، اور لبوں پر مسحور کن گیت۔ میں بے خودی میں اندر داخل ہوا۔ سب کچھ خواب جیسا تھا۔ ایک کمرہ میرے لیے سجایا گیا۔ سنہری چھت، چاندی کے فریم، قندیلوں کی روشنی، نرم پلنگ، خوشبوؤں

سے بھرا ماحول۔

میں حیران تھا، مگر حیرت کی حدیں پار ہو چکی تھیں۔

کھانا پیش ہوا..... ایسا لذیذ کہ زندگی میں کبھی نہ چکھا تھا۔

وہ دوشیزہ مجھے خاموشی سے تکتی رہی۔ پھر ایک بوڑھی عورت آئی.... سفید بال، جھکی کمر، آنکھوں میں گہری چمک۔ اس نے پھولوں کا ہار میرے گلے میں ڈال دیا۔

''آرام کرو... تم بہت تھک گئے ہو'' دوشیزہ نے کہا۔

میں پلنگ پر لیٹا تو نیند نے مجھے بے بس کر دیا۔ لیکن اچانک مجھے احساس ہوا جیسے وہ جا رہی ہو، دور ہو رہی ہو۔

میں گھبرا کر چیخا ''مت جاؤ! مجھے اکیلا مت چھوڑو!''

اور اسی چیخ کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی۔

صبح کا سورج کھڑکی سے اندر آ رہا تھا۔ پرندے چہچہا رہے تھے۔ سب کچھ عام تھا .... لیکن دل بھاری تھا۔ میں سوچتا رہا یہ خواب تھا؟ یا حقیقت؟

اسی لمحے مجھے میز پر ایک چیز پڑی نظر آئی....

وہی گرم کوٹ۔

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا اور مجھے اپنی دادی کے الفاظ یاد آئے ''انسان کی سب سے بڑی آزمائش اس کے دل کے دروازے میں ہے۔ بعض آوازیں رحمان کی ہوتی ہیں، اور بعض شیطان کی۔ جو تمہیں اپنے نفس کا پیچھا کرنے پر اُبھارے، وہ دھوکہ ہے۔ جو تمہیں سچ کی طرف بلائے، وہ نجات ہے۔''

میرے دل میں جواب اتر گیا، وہ دوشیزہ حقیقت میں نہیں تھی.... وہ میرا اپنا نفس تھا، جو خواہشات اور خوشنمائی کا روپ دھار کر مجھے گمراہی کی طرف لے جانا چاہتا تھا۔

زندگی ایک صحرا......

خواہشیں گیت گاتی ہیں۔

وہم محلات تعمیر کرتے ہیں۔

اور نفس شمع بن کر ہمیں اندھیرے کی طرف بلاتا ہے۔

اصل حقیقت وہی ہے جو انسان اپنے اندر کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔

میں نے وہ کوٹ اٹھایا، باہر نکلا، اور صحرا کی سمت پھینک دیا۔

اور دل میں کہا ''اے پروردگار! مجھے خواہشوں کے دھوکے سے بچا، اور اپنے نور کی طرف لے چل۔''

سورج روشن ہو گیا۔

اور میں پہلی بار واقعی جاگ گیا۔

☆☆

افواہ

افواہیں صرف الفاظ نہیں ہوتیں، یہ زندہ چنگاریاں ہوتی ہیں جو وقت آنے پر شعلوں میں بدل جاتی ہیں۔ یہ دلوں کو جلا دیتی ہیں، گھروں کو راکھ بنا دیتی ہیں اور صدیوں کی محبت کو لمحوں میں خاکستر کر دیتی ہیں۔

میں ایک عام سا انسان ہوں، گاؤں کی مٹی سے جڑا ہوا۔ ہمیشہ یہی سمجھتا رہا کہ ہمارا گاؤں اور آس پاس کی بستیاں محبت اور بھائی چارے کی ایسی مثال ہیں جن پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک دن ایک افواہ اس ساری بنیاد کو کھوکھلا کر دے گی۔

اس دن مجھے ایک ضروری کام سے سرینگر جانا تھا۔ صبح سویرے بہار کی تازگی دل کو روشن کر رہی تھی۔ کھیتوں میں گندم کی بالیاں ہوا کے ساتھ لہرا رہی تھیں۔ دور پرندوں کی آوازیں فضا میں نغمگی گھول رہی تھیں۔

پگڈنڈی سے گزرتے ہوئے ہر شخص نے حسبِ معمول محبت سے سلام کیا۔

''ارے بیٹا! خیر ہے؟ آج کہاں کا ارادہ ہے؟''

میں مسکرایا، ''سرینگر جانا ہے چچا، ایک ضروری کام ہے۔ سب لوگ ٹھیک ہیں؟''

''اللہ خیر کرے، بہت دعائیں۔'' گاؤں کا دستور ہی یہی تھا.... محبت، سلامتی اور ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر چلنا۔

میں سڑک تک پہنچا ہی تھا کہ سامنے گاؤں کا مشہور مسخرہ رسول شیخ نظر آیا۔ دوڑتا، ہانپتا، پسینے

میں بھیگا ہوا۔ ''ارے رکونا!'' وہ چلایا۔ ''سنا تم نے؟''

میں نے حیران ہو کر پوچھا ''کیا ہوا رسول بھائی؟''

اس نے کپکپاتی آواز میں کہا ''شاہ پور والوں نے شکار پور پر پانی بند کر دیا ہے! بڑا فساد ہونے والا ہے۔ لوگ کہہ رہے ہیں کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کو پیاسا مارنے کی ٹھان لی ہے!''

میں سکتے میں آگیا۔ ''رسول کاکا! یہ کیا کہہ رہے ہو' شاہ پور اور شکار پور تو بھائیوں سے بڑھ کر ہیں!''

وہ پریشان لہجے میں بولا ''میں بھی یہی کہہ رہا ہوں، مگر لوگ غصے میں ہیں...... کچھ بڑا ہونے والا ہے!''

اسی وقت شیخ سنا.... گاؤں کا درویش صفت بزرگ.... قریب کے بھید کے درخت سے اٹھا اور بولا ''یہ خبر جھوٹ نہیں ہے۔ میں کل بسم پور سے آیا ہوں۔ وہاں دلوں میں آگ لگی ہے۔ بس چنگاری چاہیے۔ دیکھنا آج شام تک سب کچھ بھسم ہو جائے گا۔''

میں نے لرزتی آواز میں کہا ''شیخ صاحب! آپ جیسے سمجھدار شخص کو ایسی بات زیب نہیں دیتی!''

وہ آہستہ بولا: ''سچ کا ذائقہ کڑوا ہوتا ہے بیٹا۔ دعا کرو کہ دیر نہ ہو گئی ہو۔'' اور وہ آگے بڑھ گیا۔

رسول نے گھبرا کر کہا ''میں تو گاؤں جا رہا ہوں! لوگوں کو خبردار کرنا ہوگا!''

میں کچھ کہہ بھی نہ پایا کہ ایک گاڑی رکی اور میں سرینگر کی طرف روانہ ہو گیا۔

لال چوک پہنچتے ہی فضا بدل چکی تھی۔ دکانیں جلدی جلدی بند ہو رہی تھیں۔ لوگ چیخ رہے تھے، بھاگ رہے تھے، عورتوں کے چہروں پر خوف جمع تھا۔

میں نے ایک شخص کو بازو سے پکڑا ''بھائی کیا ہوا؟ کیوں بھاگ رہے ہو؟''

وہ ہانپتے ہوئے بولا: ''فساد ہو گیا! لوگ مر گئے، گھر جل رہے ہیں!''

''کہاں؟ کس جگہ؟''

''شاہ پور اور شکار پور!''

میرے اندر جیسے زمین کھسک گئی۔ مجھے شدید دھندلاہٹ محسوس ہوئی۔ میں ایک مجمع کے پاس رک گیا جہاں لوگ ٹی وی پر خبریں دیکھ رہے تھے۔ اسکرین پر دھواں، آگ، چیخیں تھیں رپورٹر چیخ رہی تھی:

''مذہبی فساد نے دونوں گاؤں کو تباہ کر دیا ہے۔ کئی گھر جل چکے ہیں۔ ہلاکتیں بھی ہو چکی ہیں.... افواہ کے مطابق پانی بند کرنے سے یہ فساد شروع ہوا۔''

میں نے کپکپاتے ہاتھوں سے فون ملایا۔ میری بیوی کی لرزتی آواز آئی: ''کہاں ہو تم؟ ٹھیک ہو؟''

میں روہانسا ہو کر بولا: ''گاؤں میں کیا ہوا؟''

''بسم پور کے لڑکوں نے حملہ کر دیا۔ سب کہہ رہے ہیں کہ شاہ پور نے پانی بند کیا تھا! مگر ابھی پتہ چلا ہے کہ یہ صرف افواہ تھی ..... شیخ سنا نے غلط خبر پھیلائی تھی!''

میں بے جان آواز میں بولا: ''ایک جھوٹ......اور اتنی بربادی؟''

فون ہاتھ سے گر گیا۔

جب گھر پہنچا تو دیکھا.....گھر نہیں، راکھ کا ڈھیر تھا۔

شاہ پور اور شکار پور کے لوگ ایک ساتھ بیٹھے رو رہے تھے۔

کسی کے ہاتھ پر مرہم، کسی کے دل پر پچھتاوا۔ ایک بوڑھا ہندو چیخ کر رو رہا تھا: ''بیٹا میرا مسلمان تھا! مگر انسان تھا! ہم نے اسے مار دیا!''

ایک مسلمان عورت چیختی رہی:

''ہم نے کس لئے لڑائی؟ کس نے کہا تھا؟ کس کی بات مانی؟''

ہر طرف صرف ایک جملہ گونج رہا تھا: ''افواہ جھوٹی تھی......''

رات گہری ہو چکی تھی۔ ہر طرف سناٹا، جلتے گھروں کی دھیمی راکھ اور فضا میں بکھری ہوئی جلی لکڑی کی بو۔

میں ویران گلی میں کھڑا سب دیکھ رہا تھا......سب کچھ ٹوٹ چکا تھا مگر کہیں اندر ایک بے نام سی چنگاری تھی کہ شاید صبح کچھ بدل لے آئے۔

اسی وقت مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے آواز آئی، جو ٹوٹی، آہستہ اور زخمی سی تھی:

''اللہ کہتا ہے کہ اگر دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ''

یہ آواز حافظ غلام نبی کی تھی، جو کل تک ہندو آچاریہ شری کرشن موہن کے ساتھ کھیتوں کے کنارے چائے پیا کرتے تھے۔

کچھ فاصلے پر مندر کا گھنٹا بجا، اور شری کرشن موہن جی کی آواز گونجی: ''جو ہوا وہ ہوا، کسی مذہب نے نہیں سکھایا کہ گھروں کو جلاؤ اور رشتوں کو مار دو......آؤ مل کر سب ٹھیک کریں''

دونوں بزرگ آہستہ آہستہ ایک ہی سمت چلتے ہوئے گاؤں کے چوراہے پر آ گئے۔ میں بھی بھیڑ میں کھڑا تھا۔لوگ خاموش تھے..... شرمندہ، دل گرفتہ۔

مولوی صاحب نے کانپتی آواز میں کہا: ''آؤ، ہم آج یہاں عہد کریں کہ ہم کسی افواہ پر کان نہیں دھریں گے......

صرف سچ پر یقین کریں گے......''

آچاریہ جی بولے: ''آؤ ہم ہاتھ ملائیں، تاکہ بچوں کو ایک بار پھر یہ گاؤں ہاتھوں کی مضبوطی سے جوڑ کر دیں، نفرت سے نہیں۔''

دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لئے۔

انہی لمحات میں سب سے آگے کھڑا زخمی نوجوان بلجیت سنگھ اپنے بہتے خون کو کپڑے سے باندھتے ہوئے آگے بڑھا اور بولا:

''میرا چھوٹا بھائی علی آگ بجھاتے ہوئے جل گیا......اس نے میرا بچاؤ کیا۔ میں اس کی قربانی کبھی نہیں بھولوں گا۔ آج سے میرے لئے مذہب نہیں، انسانیت بڑی ہے۔''

اس کے ساتھ کھڑے علی کے والد نے آنسوؤں کے ساتھ کہا:

''اور میں بلجیت کو اپنا بیٹا مانتا ہوں۔'' ایک لمحے کے لئے ہوا تھم گئی۔

پھر اچانک سارا مجمع رونے لگا۔

وہ رونا شکست کا نہیں....

معافی اور محبت کی واپسی کا رونا تھا۔

ایک چھوٹے لڑکے نے آگے بڑھ کر دونوں کی انگلیاں تھامیں اور بولا: ''کیا ہم پھر سے ساتھ کھیلیں گے؟'' مولوی صاحب نے بچے کو گود میں اٹھایا اور کہا: ''ہاں بیٹا.... اب یہ گاؤں پھر سے جیے گا۔''

اُسی لمحے فضا میں ایک اذان گونجی، اس کے ساتھ مندر کے گھنٹے بجے، اور دونوں آوازیں مل کر ایسا لگا جیسے آسمان بھی دعا مانگ رہا ہو۔ فضا میں بھاری خاموشی کی جگہ پہلی بار امید کی روشنی محسوس ہوئی۔

اور آج بھی جب سورج چڑھتا ہے،

کھیتوں میں لہلہاتی گندم کی بالیاں ہم سے ایک ہی سوال کرتی ہیں: ''افواہ جھوٹی تھی......

مگر کیا ہم سچ سے جئیں گے؟''

☆☆

خسرہ نمبر

شام کے دھندلکے میں جب ارشد نے موبائل کی اسکرین پر زمین کے کاغذات نکالنے کی کوشش کی تو اس کی آنکھیں بے یقینی سے پھیل گئیں۔ ''نہیں...... یہ غلط ہے، ایسا نہیں ہوسکتا!'' وہ بڑبڑایا۔

اس نے دوبارہ کوشش کی۔ پھر تیسری بار بھی۔ لیکن ہر بار وہی نتیجہ......

زمین کسی سمندر خان کے نام پر درج تھی۔

ارشد کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس نے گھبراہٹ میں آواز دی ''بابا! بابا کہاں ہو؟''

شام لال کمرے سے کھانستے ہوئے نکلے۔ ''ہاں بیٹے؟ کیا ہوا؟''

ارشد نے کپکپاتی آواز میں کہا:

''بابا ہماری زمین آن لائن ریکارڈ میں نہیں مل رہی، بلکہ سمندر خان کے نام نکل رہی ہے۔''

شام لال کے چہرے پر حیرت اور خوف ایک ساتھ اُبھر آئے۔ انہوں نے بٹوہ ٹٹولا اور اس میں سے ایک پرانی، پیلی پڑی رسید نکالی جس پر خسرہ نمبر دھندلے حروف میں لکھا تھا۔

''یہ نمبر سلام الدین پٹواری نے کئی سال پہلے لکھا تھا...... اُس دن تکرار بھی ہوئی تھی۔ وہ شخص رشوت خور ہی نہیں، لوگوں کی جیبوں سے چیزیں نکالنے کا بھی عادی تھا۔ قلم، گھڑی، انگوٹھی...... کسی کو نہیں بخشتا تھا۔''

ارشد نے نمبر چیک کیا اور حیرت و غصے کے ساتھ بولا ''بابا! نمبر تو یہی ہے...... مگر مالک ہم

نہیں، سمندر خان ہیں!''

سمندر خان گاؤں کا رئیس، زبان شاہ جیسی میٹھی، اور دل کوئلے سے بھی سیاہ تھا۔

گاؤں والے اس کے سامنے جھک کر خوش ہوتے، جب کہ وہ پسِ پردہ رشوت سے لے کر بااثر تعلقات تک ہر دروازہ خرید چکا تھا۔ وہی سمندر خان، جو اکثر شام لال کے دکھ سن کر ان سے ہمدردی جتاتا تھا۔ ایک روز اس نے بڑے معصومانہ انداز میں کہا ''میں اپنی زمین اپنے بیٹوں کے نام منتقل کر رہا ہوں، تم گواہ رہنا۔ یہاں دستخط کر دو۔''

اور دھوکے سے شام لال کے دستخط لے لیے گئے......

اصل میں وہ ان کی زمین پر قبضے کا کاغذ تھا۔

اگلے دن دونوں باپ بیٹے تحصیلدار کے دفتر پہنچے اور پوری روداد سنائی۔ تحصیلدار نے روایتی سرکاری لہجے میں کہا ''ہم ایک انکوائری ٹیم تشکیل دیں گے۔ رپورٹ آنے کے بعد کارروائی ہوگی۔''

مہینے گزر گئے...... نہ ٹیم بنی، نہ رپورٹ آئی، نہ انصاف کے کوئی آثار۔

ہر بار کاغذات ایک میز سے دوسری میز، اور پھر کلرک سے دوبارہ تحصیلدار کے پاس پھینک دیئے جاتے۔

دفتر کے چکر کاٹتے کاٹتے ارشد کی برداشت آخر ٹوٹ گئی۔

''تحصیلدار صاحب!'' وہ دھاڑا،

''ہم سات مہینے سے انصاف مانگ رہے ہیں اور آپ ہمیں ٹہلاتے پھر رہے ہیں! ہم بھکاری نہیں ..... حق مانگ رہے ہیں!''

تحصیلدار کی میز پر مکا لگا ''میں تمہارا نوکر نہیں! باہر نکلو...... چوکیدار...... انہیں حوالات میں بند کر دو!''

چپراسی نے شام لال کو اتنے زور سے دھکے دیے کہ وہ فرش پر گر پڑے۔ ارشد نے باپ کو اٹھایا اور غصے میں کانپتی آواز میں چیخا:

''میں تمہیں دیکھوں گا! رشوت خوروں کو بے نقاب کر کے رہوں گا!''

انہیں دن بھر حوالات میں رکھ کر شام کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا گیا ''دوبارہ یہاں نظر نہ آنا!''

اگلے روز وہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے دفتر پہنچے۔

وہ ایک اصول پسند اور ایماندار افسر تھا۔ اس نے پوری بات سنی اور حکم جاری کیا ''تحصیلدار اور پٹواری دو دن کے اندر تمام ریکارڈ سمیت میرے دفتر میں پیش ہوں!''

دو دنوں تک پٹواری اور سمندر خان نے مختلف لوگوں کے ذریعے شام لال کو منانے کی کوشش کی، دھمکیاں اور لالچ دونوں دیے گئے۔

مگر ارشد پتھر بن چکا تھا۔

دو دن بعد میٹنگ میں مجسٹریٹ نے کاغذات دیکھ کر پوچھا ''شام لال کون ہیں؟''

''جی...... میں......'' ان کی آواز لرز گئی۔

''کیا آپ نے اپنی زمین سمندر خان کو فروخت کی؟ یہ دستخط تو آپ کے ہی ہیں۔''

شام لال کی آنکھوں کے سامنے دھوکے کے سارے مناظر گھوم گئے۔ وہ رو پڑے ''جناب! یہ فریب ہے! سلام الدین اور سمندر خان کی سازش! میں نے کبھی زمین نہیں بیچی!''

مجسٹریٹ نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا: ''تحصیلدار اور پٹواری فوری معطل!...... سمندر خان کو دفعہ 133 کے تحت گرفتار کیا جائے اور زمین شام لال کے نام بحال کی جائے!

کئی سال گزرے۔ ارشد نے محنت، سمجھداری اور دیانتداری کے بل پر قدم بہ قدم ترقی کی۔ آخر کار وہ اینٹی کرپشن بیورو کا ہیڈ بن گیا۔ ایک صبح اُس نے سلام الدین پٹواری کے گھر پر چھاپہ مارا....

کروڑوں روپے کے نوٹ، سونے کے زیور، ملکیت کے جعلی کاغذات ضبط ہوئے۔وہ گرفتار ہوا، اور کچھ دن بعد جیل میں دل کا دورہ پڑنے سے مر گیا۔

ادھر تحصیلدار نے جب ٹیلی ویژن پر ارشد کا انٹرویو دیکھا تو اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔

ڈرا، سہم گیا، اور خودکشی کر لی۔اس کی جیب میں ایک پرچی ملی ''شام لال کا بیٹا مجھے معاف نہیں کرے گا......اس لیے مر رہا ہوں۔''

☆☆

سفرِ تنہائی کا

دن ڈھل چکا تھا اور رات نے بھی اپنا رختِ سفر باندھ لیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کھڑکیوں کے کناروں سے سرسراتے ہوئے اندر داخل ہو رہی تھی۔ محمود اپنی پرانی چارپائی پر لیٹا بری طرح کھانس رہا تھا، سانس رک رک کر آتی تھی اور وہ بڑبڑاتے ہوئے کہہ رہا تھا:

''پتہ نہیں بیساکھیاں کہاں رکھی ہیں شوکت نے؟ بڑا شریر بچہ ہے!''

شوکت ہمسایے کا بچہ تھا، نہ جانے کب سے محمود کا واحد سہارا بن چکا تھا۔ پچھلے پانچ سالوں سے روزانہ اس کے پاس آتا، باتیں کرتا، کھیلتا، اور چند لمحے اس کا دل بہلاتا تھا۔ وہ دن.... جس دن محمود کی آخری زندگی کی......اس کی زوجہ سارہ بیگم، ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہوگئی تھی.... تب سے محمود کی زندگی گویا ویران ہوگئی تھی۔

سارہ بیگم ہمیشہ کہتی تھی: ''میں تمہیں کبھی اکیلا نہیں چھوڑوں گی محمود......کبھی نہیں......''

مگر موت؟ موت کسی کا انتظار نہیں کرتی۔ پل میں زندگی کو بکھیر دیتی ہے۔ سلیم اور یوسف.... وہ دونوں بیٹے جنہیں وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت بھیج کر بڑے سپنے سجا چکے تھے.... کبھی پلٹ کر نہ آئے۔ سارہ بیگم آخری سانس تک ان کا انتظار کرتی رہی، مگر آنکھیں بند ہونے سے پہلے انہیں دونوں کے ہاتھوں کا آخری قطرہ پانی بھی نصیب نہ ہوا۔

محمود نے ہچکیوں کے ساتھ خود سے کہا: ''کیسے ہوں گے میرے بچے؟ کیا کرتے ہوں گے؟ خوش بھی ہوں گے نا......''

اسے اچھی طرح یاد تھا، جب سارہ نے انہیں ولایت بھیجنے سے انکار کیا تھا: ''سُنتے ہو محمود! صبح گھاٹ پر عورتیں کہہ رہی تھیں کہ محمد شفیع کا بیٹا ولایت گیا تھا، پھر کبھی لوٹا نہیں۔ کہتے ہیں وہیں شادی کر لی، بچے ہو گئے...... مجھے ڈر لگتا ہے کہ......''

محمود نے ہنستے ہوئے جواب دیا تھا: ''او پگلی! ہمارے بچے ایسے نہیں ہیں، ہم نے انہیں بہت محبت سے پالا ہے!''

اسی بیچ دروازے پر دستک ہوئی۔ ''السلام علیکم انکل...... میں اکرم ہوں۔''

محمود نے آواز پہچان لی... کیونکہ ان کی آنکھیں اب کافی کمزور ہو چکی تھیں۔ ''آؤ بیٹے! ضرور کوئی خوشخبری لائے ہو؟ سلیم اور یوسف نے تمہیں فون کیا ہوگا؟ میرے بارے میں کیا کہا؟'' آنسو اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔

اکرم کا دل بھی لرز گیا۔ اس نے جھوٹی مسکراہٹ کے ساتھ کہا: ''ہاں انکل، وہ بہت خوش ہیں...... آپ ہی کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔''

ایک لمحہ کو محمود کی آنکھوں میں روشنی لوٹ آئی: ''گھر کب آ رہے ہیں؟ میں نے سوچا ہے دونوں آتے ہی ان کی شادی کر دوں گا، ان کی ماں کا خواب پورا ہو جائے گا... میرے افسر بیٹے...''

اکرم اپنے دل کی آگ بجھانے کی کوشش میں بڑبڑا رہا تھا ''آج سچ بتاؤں گا... کہ انہوں نے کبھی کال نہیں کی... کبھی پیسے نہیں بھیجے... یہ سب میں اپنی جیب سے دیتا رہا ہوں......''

محمود نے آواز دی: ''بیٹے، کیا کہہ رہے ہو؟''

''نہیں انکل... کچھ نہیں۔'' میں اب جا رہا ہوں کل آؤں گا.... کیونکہ اندھیرا گہرا ہو گیا ہے۔

''چراغ جلادو بیٹا۔ ماچس روشن دان پر ہے۔''

اکرم نے ماچس اٹھائی مگر چراغ میں تیل نہ تھا۔ وہ خاموشی سے سمجھ گیا کہ یہاں تو چولہا بھی مدتوں سے نہ جلا ہوگا۔

''انکل، چراغ میں تیل نہیں ہے......''

''شوکت نے گرا دیا ہوگا... بڑا شریر بچہ ہے... کوئی بات نہیں.... میں ایسے ہی گزارہ کرلوں گا......''

''کھانا کیسے کھائیں گے انکل؟''

''آج بھوک نہیں ہے بیٹا''

اکرم کی آنکھوں سے آنسو نہ رک سکے''انکل، کچھ کھانے کو لے آؤں؟''

''نہیں بیٹا! میرے پاس سب کچھ ہے... سٹور میں ہر چیز کی ڈھیر لگی ہے......''

اکرم جانتا تھا حقیقت کچھ اور ہے، مگر بے بسی کے سامنے الفاظ ہار جاتے ہیں۔

''چلو بیٹا... دیر ہوگئی۔ دروازہ باہر سے بند کر دینا... شوکت صبح خود کھول لے گا۔''

اگلی صبح شوکت بھاگتا ہوا اندر آیا''انکل! انکل! بات کرونا مجھ سے!''

جواب خاموش تھا۔ شوکت نے معصومیت سے معمول کے مطابق محمود کی ناک پکڑ کر ہلانے کی کوشش کی:''انکل! اٹھونا...''

مگر افسوس محمود سفرِ تنہائی ختم کر کے ہمیشہ کی نیند سو چکا تھا۔ ادھر اکرم بھی آچکا تھا وہ سٹور میں گیا۔ وہاں نہ چاول تھے نہ آٹا، نہ چائے نہ کھانڈ۔ صرف مکڑیوں کے جالے.... جیسے برسوں سے کسی نے چھوا تک نہ ہو۔

چالیسواں دن تھا...... گاؤں والوں نے دیکھا کہ دور سے کچھ لوگ آرہے ہیں۔ دو عورتیں، دو مرد اور چند بچے۔ سب کی چال انگریزوں جیسی تھی۔

کسی نے پہچان لیا: ''ارے! یہ تو سلیم اور یوسف ہیں! آج چالیسواں ہے، اپنے والد کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آئے ہوں گے...''

گاؤں کے بزرگ نے ادب سے کہا: ''بیٹا، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آپ کے والدین اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اگر چاہیں تو ساتھ چلیں مقبرہ پر...''

سلیم نے گہری سنکنچ کے ساتھ جواب دیا:

''No…no need to go! We want to stay here''

فقط ایک گھنٹہ!

''مگر بیٹا وہ آپ کا انتظار کرتے کرتے مر گئے...''

''تو اس میں ہم کیا کریں؟ مرنا سب نے ہے۔''

اکرم آگے بڑھا، مگر انہوں نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا۔

گھنٹہ بھر رہ کر وہ واپس چلے گئے.... اور اپنے والدین کی قبروں پر قطبہ لگانے کے کچھ پیسے دئے۔ گویا ان کی روح بھی اجنبی ہو چکی تھی۔

جانے والے چلے گئے، مگر اکرم دیر تک قبروں پر کھڑا روتا رہا ''انکل محمود... سارہ بیگم... آپ کے بیٹے بڑے افسر بن گئے ہیں...... مگر انسان نہیں بنے...''

ہوا نے قبر کی مٹی ہلکی سی اڑا دی ... شاید آسمان بھی رو رہا تھا۔

☆☆

ٹیگور ہال میں دفن خواب

کہتے ہیں ہر انسان کے اندر ایک ہال بس رہا ہے.... ایک ایسا ہال جس کی دیواریں خوابوں سے بنی ہوتی ہیں اور جہاں بے شمار خواہشیں اپنی اپنی نشستوں پر خاموش بیٹھی رہتی ہیں۔ کچھ خواب اپنی باری کا انتظار کرتے کرتے ماضی ہو جاتے ہیں، کچھ وقت کے قدموں تلے روندے جاتے ہیں، اور کچھ سماج کے زنجیری اصولوں سے ٹکرا کر دم توڑ دیتے ہیں۔

مجھے جب اپنا بچپن یاد آتا ہے تو ذہن کے پردے پر سب سے پہلے سرینگر کا ٹیگور ہال اُبھرتا ہے۔ وہ ہال میرے لیے صرف ایک عمارت نہیں تھا۔ وہ میرے خوابوں کا پہلا مزار تھا جہاں میں نے پہلی مرتبہ یہ سیکھا کہ خواب کبھی کبھی انسان کی پہنچ سے زیادہ بلند ہوتے ہیں۔

اس ہال کی اندرونی دیواروں پر ایک عجیب سی سنجیدگی تھا لگتا ہے کہ وہ دیواریں بھی صدیوں سے لوگوں کے ادھورے خوابوں کا بوجھ اٹھائے کھڑی ہوں۔ جب بھی وہاں کوئی پروگرام ہوتا، میں اور میرا دوست ہمیشہ دو سیٹیں ڈھونڈ کر ایک ساتھ بیٹھتے۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ دو سیٹیں وقت کے ساتھ ہمارے لیے علامت بن گئی.... دو نسلوں، دو مذاہب، دو خاندانوں، دو حقیقتوں کی علامت......اور شاید دو روحوں کی بھی۔

میں کبھی اُس سے سرگوشی میں پوچھتا ''بتاؤ......کیا ہم ایک ہو سکتے ہیں؟ کیا ہمارے خواب کبھی حقیقت میں ڈھلیں گے؟''

وہ ہنس کر کہتا ''خواب حقیقت بننے کے لیے ہی تو پیدا ہوتے ہیں۔ کیوں نہیں؟''

مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ خوابوں کے پروں پر اُڑنے سے پہلے انسان کو اپنے ہی سماج کی نگران آنکھیں کاٹ لیا کرتی ہیں۔

میں مسلمان تھا، وہ کسی اور مذہب سے۔ ہم نے کبھی اس فرق کو دیوار نہیں سمجھا۔ ہمارے لیے مذہب دو راستے تھے جو ایک ہی منزل تک جاتے تھے۔ مگر شاید یہ بات صرف ہم جانتے تھے، دنیا نہیں۔

اصل مسئلہ مذہب نہیں ہوتا... مسئلہ وہ آنکھیں ہوتی ہیں جو انسانوں کو انسان دیکھنے کے بجائے خاندانوں میں بانٹ کر دیکھتی ہیں۔ اللہ کے نزدیک تو عزت اعمال سے ہے..... مگر انسانوں کے نزدیک اکثر عزت نسب، برادری، قبیلے اور خاندانی روایات کے بُتوں میں بندھی رہتی ہے۔

ایک دن وہ لمحہ آیا جس نے ہماری دوستی کو خاموشی کے گھاٹ اتار دیا۔ پروگرام ختم ہوا تھا، لوگ جا چکے تھے، مگر ہم دونوں اپنی دونوں نشستوں پر خاموش بیٹھے تھے۔ اُس کی آنکھیں نمی سے بھری تھیں، اور میرے دل میں پہلی بار ایک انجانا سا خوف اترنے لگا۔

اچانک اس نے دھیرے سے کہا ''ہم ایک نہیں ہو سکتے...''

میرے کانوں میں جیسے بھونچال آ گیا۔ ''کیوں...؟ یہ کس نے کہا؟''

اس نے روتے ہوئے سر جھکا دیا ''میرے ماں باپ نے...''

یہ وہ لمحہ تھا جب مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ کبھی کبھی دشمن سامنے نہیں کھڑا ہوتا... وہ اپنے گھروں کے اندر، رسموں کے پیچھے، روایتوں کے پردوں میں چھپا ہوتا ہے۔

میں خاموشی سے ہال سے نکل آیا۔ پہلی بار میں نے خود سے کہا شاید ''واقعی ہم ایک نہیں ہو سکتے... کیونکہ جب اپنے ہی دیواریں بن جائیں تو خواب باہر کیسے نکلیں؟''

اس دن مجھے سمجھ آیا کہ خواب مٹی کے نہیں، شیشے کے ہوتے ہیں۔اور جب معاشرہ پتھر اٹھا لے تو شیشہ بچ نہیں سکتا۔

وقت گزرتا گیا۔ ہم اپنے اپنے گھروں، اپنے اپنے عقیدوں، اپنی اپنی روایتوں کے دائرے میں بند کردیے گئے۔مگران دوسیٹوں نے وہ دن کبھی نہیں بھولا... اور نہ میں۔

آج بھی جب میں ٹیگور ہال جاتا ہوں تو ہر چیز بدل چکی ہوتی ہے، مگر وہ دوسیٹیں... وہ ابھی بھی مجھے دیکھ کر چونک جاتی ہیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں ''کیا وہ نہیں آیا؟ کیا تم دونوں دوبارہ یہاں نہیں بیٹھو گے؟''

میں ان سیٹوں کے سامنے کھڑے ہوکر دیر تک سوچتا رہتا ہوں۔

کبھی مجھے لگتا ہے وہ سیٹیں دراصل ہم دونوں کی جگہ نہیں تھیں... وہ دوسیٹیں اس دنیا کی علامت تھیں.... ایک دنیا جو انسانوں کو ساتھ بٹھانے کا وعدہ تو کرتی ہے مگر انہیں جوڑنے سے ہمیشہ ڈرتی ہے۔

کہاں ہے میرا دوست؟

شاید وہ بھی کہیں کسی ہال میں بیٹھا وہی دوسیٹیں تلاش کرتا ہوگا۔شاید اس کے خواب بھی کہیں مٹی کے ڈھیر میں پڑے ہوں۔شاید وہ بھی سوچتا ہو کہ اگر ہم ایک نہیں ہوسکے تو کیا دنیا کبھی ایک ہوگی؟ میں ہر بار انہی دونشستوں کو ٹکٹ بناتا ہوں... امید کا ٹکٹ۔

شاید کسی دن وہ واپس آئے...

شاید کسی دن سماج کی دیواریں گرجائیں... شاید کسی دن انسانوں کو انسان دیکھنے والی آنکھیں دوبارہ پیدا ہوں... اور شاید.... صرف شاید.... ہم وہیں بیٹھ کر اپنی کہانی مکمل کرسکیں جہاں سے وہ ادھوری رہ گئی تھی۔تب تک، ٹیگور ہال میں دو خالی نشستیں میرا انتظار کرتی ہیں .... اور میں ان کا۔

☆☆

بابا! یہ میں ہوں !!!

رات کی خاموشی میں اذانِ فجر کی پہلی صدا فضا میں گونجی تو لگتا تھا جیسے پوری کائنات نئے دن کی سانس لینے لگی ہو۔ لیکن دنیا کے ایک گوشے میں ایک گھر ایسا بھی تھا جہاں امید اور بے چینی کی ملی جلی دھڑکنیں دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ وہ گھر...... سارہ بیگم کا تھا۔ پندرہ سال بعد ان کے گھر میں خوشیوں کے چراغ جلنے والے تھے۔ ان کے اکلوتے بیٹے شارق کی بیوی افشانہ امید سے تھی۔ گھر میں ہر شخص کے چہرے پر خوشی تھی، پر اس خوشی کے نیچے چھپا ہوا خوف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ سارہ بیگم کے لبوں پر ہمیشہ ایک دعا رہتی...... مگر وہ دعا بھی ایک عجیب سا حکم بن گئی تھی ''اے اللہ! اس بار ہماری جھولی بیٹے سے بھر دے...... بیٹی نہیں!'' جیسے اللہ سے سودا کیا جا رہا ہو۔ جیسے رحمت کو بھی جنس کی قید میں باندھ دیا گیا ہو۔ افشانہ یہ الفاظ ہر روز سنتی، مسکراتی اور چپ رہتی۔ اس کی ہنسی کے پیچھے زخموں کے وسیع صحرا چھپے تھے۔ اسے یاد تھا وہ پندرہ سال...... جب ہر زبان تیر بن کر اس کی روح کو کوستی تھی...... جب رشتہ دار انہیں طعنے دیتے تھے ''بانجھ ہے یہ!...... ''بچیوں جیسی قسمت لے کر آئی ہے''...... اوپر سے شارق بھی اس کے ساتھ برباد ہو گیا۔ افشانہ سوچتی ''کیا عورت کی گود ہی اس کی عزت ہے؟ کیا انسان ہونے کے لیے بچے پیدا کرنا لازمی ہے؟'' مگر اس کے سوال ہمیشہ خاموشی میں دفن ہو جاتے۔ دو مہینے گزرے۔ سارہ بیگم نے مشورہ دیا کہ افشانہ کو کسی ماہر ڈاکٹر کے پاس دکھایا جائے۔ یوں شارق افشانہ کو ڈاکٹر شبنم کے کلینک لے

جانے لگا۔ ڈاکٹر شبنم...... چمکتی آنکھیں، نرم لہجہ، گفتگو میں مٹھاس، اور اسی میٹھاس نے آہستہ آہستہ زہر کا کام کرنا شروع کر دیا۔ آنا جانا دوستی میں بدلا...... ڈاکٹر شبنم کے دروازے پر بادام، اخروٹ، زعفران، کشمیری چاول اور تحفے جانے لگے.... اور ایک دن تو گھر کا پالا ہوا دیسی مرغا بطور محبت پیش کیا گیا۔ اس دن جیسے شیطان نے دروازہ کھول دیا ہو۔ اس دن ایک خیال نے شارق کے دل میں زہر انڈیلا ''اگر بچی ہوئی تو؟'' شام کے جھٹپٹے میں شارق نے ڈاکٹر شبنم سے کہا: ''جانچ کرو.... مجھے معلوم کرنا ہے کہ بچہ لڑکا ہے یا لڑکی''...... ڈاکٹر شبنم نے لمحے بھر سوچا۔ ضمیر نے اسے روکا بھی ہوگا...... مگر شاید لالچ، محبت یا ہوس کا ہاتھ زیادہ طاقتور تھا۔ الٹراساؤنڈ ہوا۔ رپورٹ آئی...... بچہ لڑکی ہے۔

جیسے ہی رپورٹ پڑھی گئی، شارق کی آنکھوں میں ایک عجیب سا سایہ اتر آیا.... ایک ایسا سایہ جو انسانوں کو حیوان بنا دیتا ہے۔

وہ رات...... چاند آسمان میں اکیلا تھا اور سرد ہوا دروازوں کو ہلا رہی تھی۔ اس کمرے میں جہاں سارہ بیگم اور شارق بیٹھے تھے، فضا میں صرف ایک جملہ گونج رہا تھا ''بیٹی نہیں چلے گی۔'' افشانہ کی روح پر گویا کسی نے چاقو چلا دیا ہو۔ وہ روئی، گھٹنوں کے بل گری، ہاتھ جوڑے ''خدا کے لیے...... مجھے میری اولاد زندہ دے دو! بیٹا ہو یا بیٹی.... میں اسے جنم دینا چاہتی ہوں!'' لیکن محبت کا معیار بدل چکا تھا۔ جس شخص کے لیے اس نے سب کچھ قربان کیا تھا، وہ اس کی روح کو چیرنے پر تلا ہوا تھا۔ اور ڈاکٹر شبنم...... وہ مالیکیولز کی نہیں، موت کی ڈاکٹر بن چکی تھی۔ فیصلہ ہوا چیر پھاڑ کے ذریعے حمل ساقط کیا جائے گا۔

آپریشن تھیٹر کی ٹھنڈی روشنی افشانہ کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

جیسے روشنی نہیں، پھانسی کا پھندا ہو۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دنیا کی آخری التجا بن کر ٹک ٹک گرتے تھے۔

دوسری طرف شارق دروازے کے باہر گہری سوچ میں ڈوبا تھا۔

اس خالی ہال میں اسے اپنے قدموں کی آواز بھی اپنا دشمن لگ رہی تھی۔ جیسے دیواریں بھی اسے بددعائیں دے رہی ہوں۔ وقت گزرا۔ دروازہ کھلا۔ نرس نے ہاتھوں میں کپکپاہٹ کے ساتھ ایک چھوٹا سفید کفن اس کے حوالے کیا۔ شارق کے ہاتھ لرز گئے۔ وہ کفن کھولتا ہے......اور پھر......ایک دل دہلا دینے والی چیخ آسمان کو چیر دیتی ہے۔ وہ لڑکی نہیں تھی۔ وہ لڑکا تھا۔ چاند جیسا روشن چہرہ......آنکھیں بند، مگر اندر پوری کائنات کا دکھ......جیسے وہ خود سوال بن گیا ہو''بابا......یہ میں ہوں......میرا کیا قصور تھا؟ میں بھی تو تمہارا خون تھا......میری بھی دھڑکن تھی......میری بھی زندگی تھی......پھر تم نے مجھے کیوں مارا؟ کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟''

وہ چہرہ چیخ رہا تھا......اور وہ چیخیں شارق کے سینے کو چیر رہی تھیں۔ اسی لمحے اندر سے چیخ کی آواز آئی......افشانہ فرش پر گر چکی تھی۔ اور بے ہوش ہو کر کوما میں چلی گئی۔

آج شہر کی سڑکوں پر ایک پاگل ننگے پاؤں بھٹکتا ہے۔ آنکھوں میں سرخ آگ، ہاتھوں میں خالی کفن......لوگ اس پر ہنستے ہیں، بچے ڈرتے ہیں، مگر وہ کسی کی نہیں سنتا۔ وہ ہر آنے جانے والے کا دامن پکڑ کر چیختا ہے''ڈاکٹر شبنم نے مجھے دھوکہ دیا!''

''میرا بچہ زندہ تھا!''

''بابا...... یہ میں ہوں!'' ''یہ میں ہوں!'' اور رات کے سناٹے میں جب ہوائیں چلتی ہیں، تو لگتا ہے جیسے آسمان بھی روتا ہو......اور کہیں فضا میں وہ معصوم روح اب بھی سوال کرتی ہے''پیدا ہونے سے پہلے ہی مجھے کیوں مار دیا؟ کیا عزت کا تعلق خون سے ہوتا ہے یا جنس سے؟ کیا انسانیت بھی بیٹے اور بیٹی میں تقسیم ہوتی ہے؟''

☆☆

قیدی نمبر دوسو دو

جیل کی فصیل پر شام کی سرخی پھیل رہی تھی۔ دور پہاڑیوں کے پیچھے ڈوبتا ہوا سورج دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے آسمان پر لہو کے دھبے پھیلا دیے ہوں۔ ہوائیں تھکی تھکی سی چل رہی تھیں اور خاموشی یوں گہری تھی جیسے وقت اپنے پنجوں پر کھڑا ہو کر سانس روک کر انتظار کر رہا ہو۔ لاک اپ کے باہر دو سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ بندوقیں کندھوں پر تھیں مگر آنکھوں میں وہ بے حسی تھی جو ہر روز جرم اور سزا کے درمیان گزرتی زندگیاں پیدا کر دیتی ہیں۔ ایک سپاہی نے تھکی ہوئی آواز میں کہا ''سنا ہے آج وزیر دفاع قیدیوں سے ملنے آرہے ہیں۔ بڑا تام جھام ہوگا۔ کیمرے، میڈیا، چمکتی گاڑیاں...!''

دوسرا سپاہی بے اختیار ہنس پڑا.... ''قیدیوں کے لیے کیا فرق؟ ان کے لیے وزیر ہو یا سپاہی، سب ایک جیسے ہیں.... آوازیں جو حکم دیتی ہیں اور دروازے جو بند ہوتے ہیں!''

اچانک ڈھنڈورچی کی آواز گونجی، جو قیدیوں کی روح تک کو ہلا گئی ''تمام قیدی پارک میں جمع ہوں!'' ٹوٹے جوتے، زنجیروں کی جھنکار، اداس قدموں کی دھمکی.... قیدی قطاروں میں باہر آنے لگے۔ اس پارک میں، جو کبھی بچوں کی ہنسی اور دوڑنے کی آوازوں سے زندہ تھا، اب صرف ٹوٹے جھولے، سوکھے درخت اور زنگ آلود بینچز تھے جو وقت کی کوڑے کھا کھا کر ہڈی بن چکی تھیں سپاہیوں نے قطاریں درست کیں اور چند منٹ بعد وزیر دفاع اپنی چمچماتی گاڑی سے اترے۔ ساتھ افسران، صحافی، مائیکروفون، کیمرے اور چمکتی پالش والے

جوتے۔وزیر نے تقریر شروع کی.... انسانیت، قانون، عدل اور اصلاحات کے لمبے لمبے دعوے۔الفاظ بہت تھے لیکن سچائی کم۔

ہر لفظ آسمان پر اڑتے پرندوں کی طرح بے سمت بکھر رہا تھا۔تب وزیر کی نظر ایک نوجوان پر پڑی.... دھوپ سے جلتی ہوئی رنگت، گالوں پر کرب کی لکیریں، مگر آنکھوں میں سمندر جیسی بے خوف سچائی۔تقریر ختم کرتے ہی وزیر نے جیلر سے کہا''اس نوجوان کو میرے پاس لاؤ!''جیلر بوکھلا گیا، کپکپاتی آواز میں بولا''جی......جناب......ابھی لاتا ہوں......'' نوجوان خاموشی سے آگے آیا۔ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی مگر آنکھوں میں نمی تھی....وزیر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور تاریخی لہجے میں پوچھا''قیدی نمبر دوسودو! کس جرم میں قید ہو؟''نوجوان مسکرایا.... وہ مسکراہٹ جو ضبط اور شکست دونوں کی چیخ تھی۔''جناب، سچ بولنے کے جرم میں۔''وزیر چونک گیا.... ''کیسا سچ؟''نوجوان کی آواز آہستہ مگر پہاڑ کی چوٹی کی طرح مضبوط تھی''میں مزدور تھا، روز کماتا تھا، روز کھاتا تھا۔دو بچے ہیں، بیوی دنیا سے رخصت ہو چکی ہے۔پھر لاک ڈاؤن ہوا۔کام بند ہوا۔بھوک چیخنے لگی۔ایک دن بچوں کی روتی ہچکیوں کو برداشت نہ کر سکا۔قریبی بیکری میں گیا اور دو پیکٹ روٹی اور ایک چھوٹی سی مٹھائی کی ڈبی اٹھالی.... شاید پہلی بار جرم کیا تھا، مگر بھوک جرم سکھا دیتی ہے۔''اس کی آواز نم ہوگئی''سی سی ٹی وی کیمرے نے دیکھ لیا، پولیس نے پکڑ لیا۔پوچھا: چوری کی؟ میں نے کہا ہاں۔عدالت لے گئے۔جج نے پوچھا......جرم مانتے ہو؟ میں نے پھر ہاں کہا۔''وہ چند لمحے رکا...... ''لیکن صاحب! کسی نے یہ نہ پوچھا کہ چوری کیوں کی؟ کسی نے یہ نہ پوچھا کہ کیا چرایا؟

کسی کو یہ فکر نہ ہوئی کہ میرے بچے تین مہینے سے کہاں ہیں؟ کون انہیں کھلاتا ہے؟ قانون نے میرے نام سے زندگی چھین لی اور مجھے ایک نمبر دے دیا.... دوسودو۔ہوا

رک گئی۔ پرندے بھی خاموش ہو گئے۔ وزیر کی آنکھیں نیچی ہو گئیں۔ نو جوان نے آسمان کی طرف دیکھا اور بولا "صاحب! جرم کا وزن کبھی کبھی اتنا نہیں ہوتا جتنا بھوک کا .... یہاں لوگ قتل کریں تو ضمانت مل جاتی ہے، مگر بھوک کی چوری پر پتھر برسائے جاتے ہیں۔ میرا نام عبدالقدوس تھا.... اور اب میں صرف قیدی نمبر دوسو دو ہوں۔"

خاموشی اتنی گہری تھی جیسے وقت سوگ منا رہا ہو۔ اچانک بھیڑ کے پیچھے سے ایک صحافی نے کیمرہ سیدھا کیا اور بولا "سر! ایک فوٹو پلیز، کیپشن کے ساتھ .... "وزیر دفاع نے جیل میں دورہ کر کے انسانیت کا ثبوت دیا! وزیر کے اردگرد کھڑے سب لوگ بے ساختہ تالی بجانے لگے.... جیسے انسان نہیں، صرف خبر بن رہی ہو۔ وزیر نے چند لمحے عبدالقدوس کے چہرے میں دیکھا.... وہ چہرہ جو معاشی، عدالتی اور سماجی ظلم کی تصویر بن چکا تھا۔ مگر پھر اس نے نظریں ہٹا لیں..... کیونکہ سچائی کو دیکھنا آسان نہیں۔

قیدیوں کو واپس لاک اپ لے جایا جانے لگا۔ زنجیروں کی آواز تھکی ہوئی شام میں گونج رہی تھی۔ دروازہ بند ہوا.... اور اس کی گونج میں صرف ایک ہی جملہ باقی رہ گیا "میرا نام عبدالقدوس تھا..... اور اب میں قیدی نمبر دوسو دو ہوں......"

☆☆

آواز دو کہاں ہو

صبح کے آخری تارے جب آسمان کی پیشانی پر لرزتے ہوئے بجھنے لگے، تو ایسا محسوس ہوا جیسے خدا نے رات کی سیاہی کو اپنے ہاتھوں سے لپیٹ کر دن کے دامن میں باندھ دیا ہو۔ مؤذن کی صدا ہوا میں تیرتی ہوئی گاؤں کے کچے راستوں پر بکھر گئی۔ مگر مختار کی آنکھوں میں جو بے چینی کی آگ سلگ رہی تھی اسے کوئی اذان، کوئی دعا، کوئی تازہ روشنی بجھا نہ سکی۔ رات بھر نیند آنکھوں سے روٹھے بچے کی طرح اس سے منہ موڑے بیٹھی تھی۔ ہر لمحہ، ہر دھڑکن اسے یاد دلا رہی تھی'' ...... آج ناصر کی فیس کی آخری تاریخ ہے...... اور دل پر سوز آہ کے ساتھ جواب دیتا تھا'' دو ہزار روپے...... اور کہیں سے امید نہیں'' ...... زاہدہ اور ناصر ابھی اونچی سانسوں کی نیند میں ڈوبے تھے۔ مختار نے آہستہ سے ناصر کے چہرے پر ہاتھ پھیرا...... وہ چہرہ جس پر علم کی روشنی کا خواب جھلملاتا تھا۔

وہ چہرہ جو غربت کی مٹی سے چمک حاصل کرنا چاہتا تھا۔'' اگر آج میں نے فیس نہ دی تو میں اس کے مستقبل کا قاتل ہوں'' ...... خاموشی نے اسے جواب دیا'' ہاں...... جا...... قادر چاچا کے پاس جا'' ...... لیکن دل چیخ اٹھا'' قادر؟ وہ شخص جو دوسروں کے وقار سے کھیلتا ہے، جو قرض نہیں غلامی دیتا ہے؟'' مگر باپ کی محبت آسمان کی ہر حد پھلانگ سکتی ہے۔ اس لیے وہ چل پڑا۔

قادر چاچا گاؤں کا سب سے بڑا دولت مند تھا۔ اونچی حویلی، لوہے کے دروازے، ہر طرف

غلاموں کا ہجوم......مگر دل کی دیواریں پتھر سے بھی زیادہ سخت۔ اس کے پاس دواؤں سے بھری تجوری نہیں بلکہ انسانوں کے ٹوٹے خوابوں کے لاشے پڑے تھے۔

اس کے در پر جانا مطلب تھا غیرت کو اپنے ہاتھوں قتل کرنا۔

مختار کے قدم اس کی حویلی کے سامنے رکے.... جیسے قبرستان میں داخل ہونے سے پہلے انسان آخری بار سانس ٹھہراتا ہے۔ اندر غلاموں کی قطاریں تھیں.... کوئی پنکھا جھل رہا تھا، کوئی پاؤں دبا رہا تھا، کوئی حقہ بھر رہا تھا.... اور سب کے چہروں پر بے بسی کی لکیر۔

مختار نے سلام کیا.... مگر سلام اس جگہ ایک مردہ حرف تھا کسی نے پلٹ کر نہ دیکھا۔ قادر نے ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے غرور کے ستون کو اونچا کیا اور بولا ''کہو مختو، آج صبح صبح میرے گھر کس کا سایہ پڑ گیا؟'' آواز میں زہر تھا۔ مختار کے ہونٹ خشک ہو گئے۔

لفظ لڑکھڑانے لگے.... مگر وہ بولا ''ناصر کی فیس......دو ہزار روپے''......

قادر نے ہنکار بھری، پھر پیسے نکالے.... مگر ساتھ ایک بہی کھاتہ، ایک قلم، اور ایک مسکراتا ہوا ظلم۔ ''یہ لو، دستخط کرو......سود سمیت واپس......جلدی......''

مختار نے کانپتے ہاتھوں سے دستخط کیئے.... اور اس لمحے اس کی غیرت کی پہلی کیل ٹھونکی گئی۔ وہ گھر لوٹا، ناصر کو پیسے دیے، اور اس کی آنکھوں میں خوشی کی روشنی ابھری.... مگر مختار کی آنکھوں میں آنے والی بربادی کی دھند تیر رہی تھی۔

دس دن بھی نہ گزرے تھے کہ قادر کا ننگا غرور دروازہ توڑ کر اندر گھس آیا اور پیسوں کا تقاضا کیا.... مختار کی حالت ایسی تھی جیسے کسی دریا کے کنارے کھڑا ہو کر پانی کو جھولی میں بھرنا چاہتا ہو.... ممکن ہی نہیں تھا۔

''کچھ مہلت دے دو چاچا''......

''مہلت؟ میں بھکاریوں کے ساتھ سودا نہیں کرتا۔''

اگلے ہی روز چیلوں نے مختار کا کچا گھر گرا دیا، سامان سڑک پر پھینک دیا، اور عزت کو مٹی میں ملا دیا۔ لوگ تماشہ دیکھتے رہے.... کسی کے دل نے جنبش نہ کی کیونکہ گاؤں کا ضمیر بھی قادر کی تجوری میں قید تھا۔

مختار اور زاہدہ روتے ہوئے گاؤں سے نکلے.... صرف ایک سوال لیتے ہوئے "ہمارا ناصر کہاں ہے؟" وہ شہر کی جانب روانہ ہوگئے.... جہاں انسان سمندری لہروں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے گم ہو جاتے ہیں۔ کوئی پناہ نہ ملی، کوئی ہاتھ بڑھا نہیں، انہوں نے فٹ پاتھوں پر راتیں گزاریں۔

اور ایک دن وہ گم ہو گئے.... بالکل اسی طرح جیسے دعا آسمان پر چڑھ کر بے جواب لوٹتی ہے۔ مہینوں بعد ناصر آیا.... گھر کے دروازے پر کھڑا ہوا.... مگر وہاں گھر نہیں تھا، صرف مٹی، ٹوٹے بانس، بکھرے پتھر.... اور یادوں کی بے آواز چیخیں۔ وہ زمین پر بیٹھ کر مٹی اپنے ہاتھوں میں بھرنے لگا.... جیسے وہ ان ٹوٹے ذروں سے اپنے والدین کی سانسیں تلاش کرنا چاہتا ہو۔

"ابو.... امی...... کہاں ہو؟ آواز دو...... کہاں ہو؟"

اس کی چیخ نے گاؤں کی روح ہلا دی.... پر جواب خاموشی تھا پیچھے سے قدموں کی چاپ آئی.... ایک بھاری ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا گیا، اور ایک ٹھنڈی آواز گونجی "یہ زمین اب میری ہے"...... وہ قادر تھا.... وہی فرعون.... وہی قاتل.... وہی ظالم۔

ناصر زمین پر گر پڑا اور آسمان کی طرف چیخا "اے رب! انصاف کہاں ہے؟ ہوا لرزی، بادل گرجے..... مگر جواب پھر بھی نہیں آیا۔ رات کے سناٹے میں جب ہوا گاؤں کے کھنڈرات سے گزرتی ہے تو لوگ آج بھی کہتے ہیں "سنو...... کوئی پکار رہا ہے...... آواز دو...... کہاں ہو"......

☆☆

کچہریوں کا چکر

میں اس روز گھر میں بیٹھا ایک پُرانا اخبار پڑھ رہا تھا۔اس دن اخبار والا لڑکا ابھی تک اخبار لے کر نہیں آیا تھا۔میں سوچ رہا تھا کہ آخر آج وہ کیوں نہیں آیا۔اسی اثنا میں میری چھوٹی بیٹی شبروزہ چائے لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔

''ابو، چائے...''

''ہاں ہاں، رکھ دو۔''

میں نے پیالی ہاتھ میں لی، دو گھونٹ پیے اور بے اختیار منہ سے نکل پڑا ''آہ! یہ دنیا بھی...!''

''کیا ہوا ابو؟'' شبروزہ نے چونک کر پوچھا۔

''کچھ نہیں۔''

''نہیں ابو، کچھ تو ہے۔''

میں جواب دینے ہی والا تھا کہ باہر سے آواز آئی ''اخبار...!''

شبروزہ لپک کر گئی اور اخبار لے آئی۔میں نے اخبار ایک طرف رکھا اور پوچھا ''ندیم کہاں ہے؟ کل رات سے وہ نظر نہیں آرہا ہے۔''

''ابو، وہ کل اپنے دوست بلال کے گھر گیا تھا، ابھی تک واپس نہیں آیا۔''

''کس بلال کے گھر؟''

''صمد کاکا کے!''

میری زمین پاؤں تلے کھسک گئی۔ میں بلال کو جانتا تھا.... بدچلن، آوارہ، اور شریر لڑکا۔ غصہ مجھ پر اس طرح سوار ہوا کہ میں ہوش کھو بیٹھا۔ میں نے شبروزہ کو زور سے ایک تھپڑ رسید کر دیا۔

''مجھے کیوں نہیں بتایا؟''

شبروزہ چیخ مار کر کمرے سے باہر بھاگ گئی۔ اسی لمحے میری بیگم دوڑتی ہوئی آئیں۔

''کیا ہوا؟ بچی کیوں رو رہی ہے؟''

''ممی، پاپا نے مجھے تھپڑ مارا...''

بیگم کا دل بھر آیا۔ وہ شبروزہ سے بے حد پیار کرتی تھیں۔ ان سے بھی ضبط نہ ہو سکا۔

''آخر اس نے کیا کیا تھا جو آپ نے اس پر ہاتھ اٹھایا؟ یہ تھپڑ اسے نہیں، تجھے مارنا چاہیے تھا!'' ندیم کہاں ہے؟ میرا غصہ اور بھڑک اٹھا، مگر میری بیگم نے دھیمی آواز میں بات کاٹ دی....

ندیم ..... ہاں!!! ہے''اوپر، اپنے کمرے میں ہوگا۔''

''اسے فوراً بلاؤ!''

''وہ... وہ گھر پر نہیں ہے۔''

''کہاں ہے؟''

''صمد کاکا کے گھر گیا ہے۔''

انہوں نے تلخ لہجے میں کہا'' آپ کے لاڈ پیار نے اسے برباد کر دیا ہے۔ بلال اس کا دوست ہے، اور میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ اس کے ساتھ نہ جانے دیا کریں۔ اس کے تیور ٹھیک نہیں...''

ابھی بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔

''شاید ندیم آ گیا...'' بیگم نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھیں۔

مگر باہر سے سخت آواز آئی ''دروازہ کھولو!''

''یہ بلال کی آواز نہیں ہے...'' بیگم نے چونک کر کہا۔

دروازہ کھلا تو سامنے پولیس انسپکٹر کھڑا تھا۔

''مسٹر رشید کہاں ہے؟''

''ج...جی، کیا ہوا جناب؟''

''اسی سے بات کرنی ہے۔''

وہ میرے کمرے میں آیا۔ میں نے سلام کیا، مگر اس نے جواب دینا بھی گوارا نہ کیا۔

''اچھا، تم ہی مسٹر رشید ہو؟''

اس نے سپاہیوں کو حکم دیا ''پورے گھر کی تلاشی لو!''

وہ میرے کمرے میں لاٹھی گھماتا ہوا ٹہل رہا تھا، مجھے یوں گھور رہا تھا جیسے میں مجرم ہوں۔ میرا دل چاہا کہ اس کا گلا دبا دوں، مگر میں اپنے ہی گھر میں بے بس تھا۔

''صاحب، کچھ نہیں ملا۔'' سپاہیوں نے کہا۔

انسپکٹر نے میری طرف دیکھا ''تمہارا بیٹا اور اس کا دوست... کیا نام ہے؟''

''بلال...''

''کل رات چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے ہیں!''

نہیں جناب! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا بیٹا...

''یہ تو ہر باپ کہتا ہے!'' اس نے بات کاٹ دی۔ اور ہاں!!! تھانے پر آنا وہیں پر بات کریں گے...

میں نے تھانے جا کر اپنے بیٹے سے پوچھا۔ کہ کس چیز کی چوری کی ہے؟ ....

''بابا، میں نے کوئی چوری نہیں کی۔

اور جب دیکھا ان کا دوست بلال ہی سرکاری گواہ ہے!''

میں تذبذب میں تھا کہ کیا کروں۔ تھانے سے باہر نکل رہا تھا کہ ایک سپاہی نے پیچھے سے آواز دی۔

''صاحب!''

''ہاں؟''

وہ آہستہ بولا'' آپ کا بیٹا چور نہیں ہے۔ اسے انسپکٹر کی بیٹی سے محبت ہو گئی تھی، اسی لیے اسے اندر کیا گیا ہے۔ مگر صاحب... انسپکٹر کو میرا نام مت بتانا، ورنہ...''

''نہیں، نہیں... میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔''

اسی دن سے میں نے کچہریوں کے چکر لگانا شروع کیے۔ کبھی تاریخ، کبھی پیشی، کبھی وکیل، کبھی فیس۔ انصاف کہیں نہ ملا۔

بلال نے جھوٹا الزام میرے بیٹے پر تھوپ دیا، اور میرا بیٹا اس جرم کی سزا کاٹ رہا جو اس نے کیا ہی نہیں تھا۔ اسی غم میں میری بیگم دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ بیٹیوں کی شادیاں ہو گئیں۔

اور میں اکیلا رہ گیا.... عدالتوں کے برآمدوں، فائلوں اور تاریخوں کے درمیان۔

آج برسوں بعد بھی میں روز صبح کچہری کے دروازے پر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ ہاتھ میں ایک پرانی فائل، آنکھوں میں ایک ہی سوال۔

کبھی کبھی لگتا ہے کہ میرا بیٹا جیل میں نہیں، بلکہ میں خود ان کچہریوں میں قید ہوں۔ شام کو جب سورج عدالت کی عمارت کے پیچھے ڈوبتا ہے، تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انصاف بھی فائلوں کے نیچے دب کر خاموشی سے مر جاتا ہو۔ اور میں... میں اب بھی اسی انتظار میں

ہوں کہ شاید کسی دن کسی کمرۂ عدالت میں میرے بیٹے کا نام مجرموں کی فہرست سے خاموشی سے کاٹ دیا جائے اور انہیں باعزت بری کیا جائے......

☆☆

اور خوشی مرگئی

جب سلمان کُد، جموں کی جیل سے سزا کاٹ کر واپس آیا تو اس کا جسم گھر لوٹا تھا، مگر اُس کی روح ابھی تک قید تھی۔ محلے کی گلیاں وہی تھیں، دروازے وہی، مگر ہر چیز اجنبی لگ رہی تھی... جیسے وقت نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا ہو۔

لوگ تعزیت اور مبارک باد کے ملے جلے جذبوں کے ساتھ اس کے گھر آئے۔ کوئی خاموش تھا، کوئی حد سے زیادہ بول رہا تھا۔ کسی نے اس کے ہاتھ کو زور سے تھاما، جیسے یقین دلانا چاہتا ہو کہ وہ واقعی آزاد ہے۔ مگر سلمان جانتا تھا کہ رہائی کے کاغذ آزاد کرتے ہیں، یادیں نہیں۔

چائے کے کپ گردش میں تھے کہ ایک رشتہ دار نے کہا "سلمان! کہتے ہیں کُد کی مٹھائی بہت لذیذ ہوتی ہے، تم کیوں نہیں لائے؟"

یہ جملہ ہنسی میں کہا گیا تھا، مگر سلمان کے اندر کسی زنگ آلود دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ اُس نے سر جھکا لیا۔ آنکھوں کے سامنے جیل کی کوٹھری آ گئی .... سرد دیواریں، لوہے کی سلاخیں، اور وہ راتیں جن میں خواب بھی سزا کاٹتے تھے۔ مٹھائی؟ وہاں تو دن کڑوے تھے، اور راتیں بے ذائقہ۔

لوگ باتوں میں لگ گئے، مگر سلمان کی سماعت نے ہڑتال کر دی۔ آوازیں دور ہوتی گئیں۔ اُس کے اندر ایک چھوٹا سا بچہ تھا جو کبھی خوشی مانگتا تھا، آج وہ بھی خاموش بیٹھا تھا، جیسے تھک

گیا ہو۔ سلمان نے سوچا، خوشی بھی شاید ایک جرم ہے.... جسے وہ مدت پہلے کر چکا تھا، اسی لیے اس کی سزا ابھی تک جاری ہے۔ وہ آئینے کے سامنے سے گزرا۔ آئینے میں ایک چہرہ تھا جس پر مسکراہٹ کا نشان کبھی رہا ہوگا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے چہرے کو چھوا، جیسے یقین کرنا چاہتا ہو کہ وہ زندہ ہے۔ مگر اس لمس میں بھی کوئی حرارت نہ تھی۔ اسی لمحے اسے محسوس ہوا کہ خوشی کسی دن چیخ کر نہیں مرتی.... وہ آہستہ آہستہ، سوالوں میں، جملوں میں، اور بے ضرر ہنسیوں کے نیچے دم توڑ دیتی ہے۔

سلمان نے پھر سے سر جھکایا۔

اس بار صرف شرمندگی نہیں تھی، یہ ایک جنازہ تھا.... جس میں لاش بھی وہی تھا اور سوگوار بھی۔ اور یوں سلمان کے چہرے پر خوشی مر گئی۔

☆☆

میں ایسا کیوں بنوں

سلیم نے والدین کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔اولڈ ایج ہوم کے دروازے پر پہنچ کر والد نے آہستہ سے کہا ''بیٹا... میں نے اپنے والد کو یہاں نہیں چھوڑا تھا، وہ تو دوسرے اولڈ ایج ہوم میں تھا۔''

یہ جملہ سلیم کے قدموں میں زنجیر بن گیا۔اس نے دروازے کی طرف دیکھا، پھر والد کے جھریوں بھرے چہرے کی طرف.... اور بغیر کچھ کہے انہیں واپس لے آیا۔

گھر پہنچتے ہی بیوی کے لہجے میں آگ لگی ہوئی تھی۔

''آپ انہیں وہیں چھوڑ کر کیوں نہیں آئے؟

کیا اب ہمیں ساری زندگی انہی کے ساتھ گزارنی پڑے گی؟''

سلیم نے ایک لمحہ سوچا، جیسے اپنے اندر کسی پرانے آئینے میں جھانک رہا ہو۔

پھر مضبوط آواز میں کہا ''ہاں... ساری زندگی انہی کے ساتھ گزارنی پڑے گی۔'' یہ بات بیوی کو چبھ گئی۔وہ جھٹ سے کھڑی ہوئی ''تو پھر میں ہی یہ گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہوں!''

سلیم نے سکون سے کہا ''بہتر ہے، میکے چلی جاؤ۔وہاں بھی تو تمہارے بھائیوں نے اپنے والدین کو اولڈ ایج ہوم میں رکھا ہے۔''

بیوی تڑپ کر بولی ''میرے بھائی ایسے نہیں ہیں، ان کے بارے میں مت کہیے!''

سلیم مسکرایا.....مگر اس مسکراہٹ میں خوشی نہیں تھی، آئینہ تھا۔اس نے آہستہ سے

کہا ''ہاں... بات تو سچ ہے۔

جب وہ ایسے نہیں ہیں......

تو میں ایسا کیوں بنوں؟''

کمرے میں خاموشی پھیل گئی۔

اوراس خاموشی میں اولڈ ایج ہوم کے دروازے بند ہو گئے......

☆☆

شادی

شبنم کے باپ کو فوت ہوئے پندرہ برس گزر چکے تھے، اور بڑے بھائی نے شادی رچاتے ہی گھر کی دہلیز پار کر لی تھی۔ اب وہ اپنی بیمار ماں کے ساتھ ایک خالی گھر میں زندگی گزار رہی تھی۔

پرسوں اس کی شادی تھی۔

وہ اپنی سہیلی شائستہ کے پاس گئی اور آہستہ سے بولی ''شائستہ، کل مہندی کی رات ہے، تم بھی آ جانا......''

''او......واہ! یہ تو خوشی کی بات ہے۔ کیک کہاں سے بنوایا؟ لہنگا کہاں سے لینا ہے؟'' شائستہ نے شوخی سے پوچھا۔

یہ سن کر شبنم کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اس نے نظریں جھکا لیں اور دھیمی آواز میں بات ٹالتے ہوئے کہا ''اگر آپ کے پاس کپڑے کا کوئی پُرانا جوڑا ہو تو مجھے دے دیجئے......میں وہی پہن کر سسرال چلی جاؤں گی۔''

☆☆

ڈاکٹر کا نسخہ

سیل، سیل، سیل

گرم ملبوسات کی سیل....

بازار چیخ رہا تھا، بورڈ جگمگا رہے تھے، لوگ بھاؤ تاؤ میں مصروف تھے۔ اور ایک کمرے میں ایک باپ اپنی سانسوں کی قیمت گن رہا تھا۔

خوشبو دوڑتی ہوئی آئی "بابا... میرے لیے بھی گرم کپڑے خرید لو، چلہ کلاں آنے والا ہے، میرے کپڑے پھٹ چکے ہیں..."

اکبر نے بیٹی کو پاس بلایا، کانپتے ہاتھوں میں ایک تھیلا تھما دیا۔

"لے لو بیٹا، اپنے اور اپنی بہن کے لیے کچھ گرم لے آؤ..."

خوشبو نے تھیلے میں ہاتھ ڈالا،

نوٹ نہیں نکلے.... بلکہ سچ نکل آیا۔ ایک کاغذ، بلڈ کینسر۔

آپریشن کے لیے تیس لاکھ روپے درکار ہیں۔

خوشبو کی چیخ کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر واپس اس سماج پر پڑی.... مگر سماج بہرا تھا۔ "بابا! تم نے ہمیں کیوں نہیں بتایا؟" اکبر نے سر جھکا لیا' بیٹا...

یہاں سچ بولنا بھی امیروں کی عیاشی ہے۔" وہ تھیلا خالی تھا، جیسے سرکاری ہسپتال کی الماریاں، جیسے وعدوں کی فائلیں، جیسے غریب کی جیب۔ بازار میں سیل تھی، مگر انسان کی

زندگی پر کوئی رعایت نہیں تھی۔ اکبر کے پاس بیماری کا سٹرٹیفکیٹ تھا، علاج کا نہیں۔ اس سماج نے اسے سکھایا تھا کہ غریب کے لیے ڈاکٹر کا نسخہ بھی ایک مذاق ہے۔ اور خوشبو سمجھ گئی یہ جنگ سردی سے نہیں، اس نظام سے ہے۔ جہاں کپڑے سستے ہیں اور انسان مہنگا۔

☆☆

موت کے فرشتے

پندرہویں صدی کا ایک انسان تپسیا سے نکل کر اکیسویں صدی میں آ پہنچا۔ راستے میں دوڑتی ہوئی مشینوں کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا اور ایک راہ گیر سے پوچھا ''یہ کیا ہیں؟''

راہ گیر مسکرا کر بولا ''موت کے فرشتے۔''

وہ خاموش ہو گیا، پھر دھیرے سے بولا ''عجیب زمانہ ہے......

ہم نے موت کو پہچاننے کے لیے عمریں گزار دیں، اور تم نے اسے رفتار سکھا دی۔'' یہ کہہ کر وہ واپس لوٹ گیا، کیونکہ کچھ راستے ہر صدی کے انسان کے لیے نہیں ہوتے۔

☆☆

اُجڑا مسافر گھر کو لوٹ آیا

ہر انسان کی زندگی میں کوئی نہ کوئی مشغلہ ضرور ہوتا ہے۔کوئی باغبانی کرتا ہے، کوئی شاعری، کوئی افسانہ نگاری، اور کوئی سوانح عمری لکھتا ہے۔میرا مشغلہ یہ تھا کہ میں دنیا گھوموں، کیونکہ میں نے بچپن میں سنا تھا کہ دنیا گول ہے، اور میں یہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا کہ اگر دنیا گول ہے تو آخر کیسے ہے! بڑا ہوا، سائنس پڑھی، تو معلوم ہوا کہ مجھ سے بہت پہلے ایک صاحب.... فرڈیننڈ میگالن.... یہ کارنامہ انجام دے چکے ہیں، وہ بھی آبی جہاز میں۔

دل میں رنج سا ہوا کہ مجھ جیسے ذہین سے پہلے ہی اس نے یہ سب کر دکھایا۔کاش وہ میرے وقت میں ہوتا تو میں اسے سبق سکھاتا کہ دوسروں کے خیالات پر ڈاکا نہیں ڈالتے!

خیر، یہ تمنا بھی ترک کردی۔

پھر سوچا کہ کیوں نہ اس سے بھی بڑا کام انجام دیا جائے....

یعنی دنیا نہیں، اپنے ہی گاؤں کا چکر لگایا جائے۔یوں ایک پارٹی وجود میں آئی۔ساتھی آتے رہے، اور ہم موج کرتے رہے۔دن میں جو بھی کام ہوتا، اس کا جائزہ لینا میری ذمہ داری تھی، اور شام کو حساب بھی میں ہی لیتا تھا، کیونکہ اس سارے نظام کے پیچھے ماسٹر مائنڈ میں ہی تھا۔

شام کو جب کسی عورت کا مرغا یا بطخ غائب ہوتا تو وہ کوستی، ہاتھ اٹھا کر بددعائیں دیتی کہ "اللہ

مرغے چوروں کو غارت کرے!" یہ سن کر میں اندر ہی اندر کانپ جاتا، کیونکہ اللہ کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی۔ چنانچہ میں فوراً دوہرا چہرہ اوڑھ کر اس کے پاس پہنچ جاتا اور نہایت سنجیدگی سے پوچھتا "چاچی، کہیں مرغا سفید تو نہیں تھا؟ پونچھ ذراسی سرخ؟" وہ فوراً کہتی "ہاں بیٹا، بالکل ایسا ہی تھا!" میں آہ بھر کر کہتا "افسوس... صبح دس بجے گیدڑ اُٹھا لے گیا۔ اللہ کی قسم، میں نے خود دیکھا تھا!" ہم ویسے بھی ایک دوسرے کو الگ الگ ناموں سے پکارتے تھے....

کوئی گیدڑ، کوئی بھیڑیا، کوئی سفید کتا، اور کوئی جنگلی بلی۔

یوں بددعائیں بند ہو جاتیں، اور شام کو مرغا یا بطخ بڑے سکون سے ہماری پلیٹ میں ہوتا۔ کبھی اگر کچھ ہاتھ نہ لگتا تو اپنے ہی گھروں سے حلوے کا سامان چرا لیتے، اور حلوے پر ہی گزارا ہو جاتا۔ وقت گزرا تو شوق نے کروٹ بدلی۔ ایک دن ہم نے مل کر منصوبہ بنایا کہ پورے ہندوستان کا چکر لگا کر گنیز بک آف ورلڈ میں اپنے گروپ کا نام درج کروائیں گے۔ سب میری بات پر متفق ہوئے، تیاری شروع ہوئی، اور ہم دہلی روانہ ہو گئے.... راستے میں ایک غریب بڑھیا کی بطخ بھی ساتھ لے گئے، پکا کر!

دہلی پہنچ کر یوں محسوس ہوا جیسے ہم نے کوئی نیا قلعہ فتح کر لیا ہو۔ میں نے خود کو مغل بادشاہوں کا بادشاہ سمجھنا شروع کر دیا... آنکھوں پر کالی عینک، سر پر آوارہ فلم والی روسی ٹوپی، اور پاؤں میں نوکیلا جوتا۔ ہوٹل میں کمرہ ملا، مگر وہ کمرہ چوہوں نے پہلے ہی بک کر رکھا تھا۔ پہلی ہی رات تصادم شروع ہو گیا۔ ہم چاہتے تھے معاملہ پُرامن طریقے سے حل ہو، مگر چوہے کسی مذاکرات کے موڈ میں نہ تھے۔ رات بھر آنکھ مچولی چلتی رہی۔ دہلی میں دو چار دن خوب گھومے۔ جس جس سے ملتے، اسے پان چباتے دیکھا۔

ایک دن لعل قلعہ جانے کا ارادہ ہوا۔ بیٹری (آٹو) روکی تو ڈرائیور نے کھڑکی سے سر نکال کر

پان چبا چبا کر پوچھا ''ٹھاں ڈانا ہے؟''

مجھے کچھ سمجھ نہ آئی، میں نے بھی پان چبانے کا ناٹک کرتے ہوئے کہا ''مُڈھے آپ ٹی باٹ سمجھ میں نہیں آئی!'' اچانک اس نے ایسی پان کی پیک ماری کہ میں بال بال بچ گیا۔ لگا جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو۔ اسی لمحے مجھے اپنے مرحوم دادا یاد آ گئے... جن کے بلغم نے کبھی ایک معصوم چڑیا کو زندگی اور موت کے بیچ لا کھڑا کیا تھا۔ میں نے اس دن چڑیا کو آزاد کیا تھا، مگر آج مجھے آزاد کرنے والا کوئی نہ تھا.... سوائے اسی ڈرائیور کے۔ آخر کار سو روپے میں سودا طے ہوا۔ ہم لعل قلعہ، قطب مینار، اور نظام الدین اولیاء گھوم آئے۔ پھر وطن کی یاد ستانے لگی۔ اگلے دن صبح بستر باندھا، بیٹری لی، اور ریلوے اسٹیشن روانہ ہوئے۔ اوور لوڈ بیٹری نالی میں الٹ گئی، اور ہم سب گٹر میں جا گرے۔

نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

لوگ جمع ہو گئے، ہمیں نکالا گیا، پانی ڈالا گیا، مگر بدبو ایسی تھی کہ لوگ فاصلے سے بات کر رہے تھے۔ کسی نے کہا، ''شاید یہ بہار کے ہیں!'' ٹرین میں بھی سیٹ نہ ملی۔ آخر کار دھکے کھاتے گھر پہنچے۔ گھر والوں نے پہلے پہچاننے سے انکار کر دیا.... گٹر کے رنگ نے ہمیں اجنبی بنا دیا تھا۔ نہا دھو کر، کپڑے بدل کر ہم نے ایک دوسرے سے عہد کیا کہ اب یہ سب چھوڑ کر عزت کی زندگی گزاریں گے۔ اسی جگہ دو دو رکعت نمازِ شکرانہ ادا کی کہ ہم زندہ بھی لوٹے، اور سبق سیکھ کر بھی۔

آج ہم اپنی زندگی کے سفر میں آسانی سے، خاموشی سے، اور کچھ سمجھ داری کے ساتھ چل رہے ہیں۔

☆☆

کیا انصاف ہے!

''امی مجھے آج نائٹ ڈیوٹی ہے اس لیے گھر واپس نہیں آؤں گی'' گھر سے نکلتے وقت سپنا نے امی سے کہا.... بھگوان آپ کی رِکشا کرے امی نے کہا....

صبح ہوتے ہی گھر کے فون کی گھنٹی بجنے لگی اور سپنا کی چھوٹی بہن کویتا نے فون اٹھایا... ہیلو.....ہیلو..... ہم بٹ نگری میڈیکل کالج سے بول رہے ہیں کیا ہماری بات مُولہ رام سے ہوگی....

جی ہاں!!! ابھی بُلاتی ہوں..... پاپا..... پاپا دیدی کے کالج سے فون آیا ہے آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں......

کیوں خیریت ہی تو ہے؟ مولہ رام نے کویتا سے پوچھا۔

پتہ نہیں..... یہ آپ سے ہی بات کرنا چاہتے ہیں....

ہیلو.....ہیلو.....کون بول رہا ہے۔آپ نے سویرے کیوں فون کیا؟......

ہم سپنا کے میڈیکل کالج سے بول رہے ہیں دل تھام کر سُن لیں.....آئی ایم سوری ٹو سے.....کہ سپنا اب اس دنیا میں نہیں رہی!!! کالج آ کر لاش لے لیں......

کککک کیا کہا میں نے اچھی طرح سے نہیں سُنا مولہ رام نے تھرتھراہٹ سے پوچھا مزاق مت کیجئے......

ہاں.....آپ نے ٹھیک طرح سے سُن لیا ہے کہ سپنا اس دنیا میں نہیں رہی......

یہ سُنتے ہی مولہ رام کے ہاتھوں سے رسیور گر گیا اور ان سے ایک چیخ نکل دی......ہائے سپنا......ہائے سپنا......

وہ ننگے پیر گھر سے نکل گیا اور اس کے پیچھے پیچھے ان کی بیوی اور بیٹی کویتا بھی اپنے سروں کو پیٹتے پیٹتے بے خبر دوڑ رہی تھیں...... میڈیکل کالج پہنچتے ہی ان کے حواس اُڑ گئے.... کیونکہ ان کی بیٹی سپنا کفن لپیٹی بیڈ پر سو رہی تھی اور خون جاری تھا......

کیا ہوا ہماری بیٹی کو؟ امی نے رو رو کے وہاں کھڑے ایک ڈاکٹر جس کی آنکھوں سے خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں سے پوچھا......

ڈاکٹر نے رو رو کر جواب دیا کہ اس کو رات کی تاریکی میں ہوس کے پجاریوں نے اپنے ہوس کا شکار بنا دیا.... ایف آئی آر درج ہوا اور تحقیقاتی ایجنسی اس کی تحقیقات میں لگی ہے بہت جلد مجرموں کا پتہ چلے گا....

تب سے مولا رام تھانے کی چکر کاٹتا رہا کہ ان کی بیٹی کے قاتلوں کا پتہ چلے اور ان کی پھانسی ہو جائے مگر ایک دن تھانے دار نے ان سے یہ کہہ کر تھانے سے بھگا دیا کہ ”آپ کی بیٹی نے خودکشی کی تھی،،

یہ جھوٹ ہے......سراسر جھوٹ......میری بیٹی ایسا نہیں کر سکتی تھی ان کو ایک سازش کے تحت مارا گیا مولا رام نے کہا......

کیسے باپ ہیں آپ اُس سازش میں آپ کا بھی ہاتھ ہے آپ کو بھی جیل ہو سکتی ہے اگر آپ چُپ نہ رہے......

بے چارہ مولا رام روتے ہوئے سیدھے گھر پہنچے اور تب سے ہر کسی سے یہی سوال کرتا رہا......کیا میری بیٹی کو انصاف ملے گی؟

☆☆

یہ پتھر ہے!

ڈیڈی مجھے آج ایک لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔ارشد نے والد سے کہا......کس لئے بیٹا؟ کیوں کہ کالج میں سبھی کے پاس آئی فون ہیں مجھے بھی لانا ہے....بیٹا آپ کو آئی فون سے زیادہ پڑھنے کی ضرورت ہے......آپ بہترین تعلیم حاصل کرو گے تو نوکری ملے گی...... نوکری ملے گی تو پیسہ ملے گا۔پیسہ ملے گا تو سب کچھ ممکن ہے....میں یہاں آپ کی تقریر سُننے نہیں آیا ہوں بلکہ میں یہاں صرف اور صرف پیسے لینے کیلئے آیا ہوں ارشد نے غصے سے کہا....بیٹا آپ کو پتہ ہے کہ میں ایک مزدور ہوں مشکل سے گھر کا گزارہ ہوتا ہے میں اتنے پیسے کہاں سے لاؤں......

مجھے کچھ نہیں سُننا ہے بس مجھے پیسے چاہیے ارشد نے اپنے والد کو کھری کھری سُنائی، کھاتے کھاتے آپ کی توند نکل چکی ہے......نہیں بیٹا ایسا نہیں ہے میں ایک ایک پیسہ جمع کر کے آپ کو پالتا ہوں اور کالج کی فیس جمع کرتا ہوں آپ کو ایسا نہیں کہنا چاہئے......

ارشد اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور اپنے والد کے پیٹھ پر زور دار لات ماری اور وہ زمین پر گر پڑا......جب ارشد نے والد کو گرتے ہوئے دیکھا تو جلدی سے واپس آیا، اس کو اٹھانے کی کوشش کی مگر بدقسمتی سے والد کی پیٹ سے قمیض اُٹھ گئی......ارشد کی نظر جب اُس کی پیٹ پر پڑی تو وہ یہ دیکھ کر چونک گیا کہ اس کی پیٹ پر ایک بہت بڑا پتھر باندھا ہوا تھا اب ارشد ہکا بکا رہ گیا......جب اُنہیں کچھ وقت کے بعد ہوش آیا تو ارشد نے اس پتھر کا ماجرا

پوچھا...... بیٹے یہ پتھر میں نے اس لئے باندھ رکھا تھا کہ مجھے اس سے بھوک مٹ جاتی تھی کیونکہ جو کچھ بھی کماتا ہوں وہ آپ کی فیس پر خرچ ہوتا ہے اور ہاں بیٹے...... یہ میری تو ند نہیں نکل چکی تھی بلکہ یہ پتھر تھا...... یہ سُن کر ارشد کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور اپنے باپ سے معافی مانگ لی......

☆☆

خط جو ابھی تک نہیں کھلا تھا

غفور چاچا کے گھر میں وقت دیواروں کے ساتھ ٹک کر رہ گیا تھا۔ گھڑی تھی، مگر چلتی نہیں تھی..... یا شاید وقت نے یہاں چلنا چھوڑ دیا تھا۔ دروازے کے پاس رکھا جوتوں کا جوڑا برسوں سے اپنی جوڑی تلاش کر رہا تھا، اور صحن میں لگے درخت کی شاخیں ہوا سے نہیں، یادوں سے ہلتی تھیں۔ غفور چاچا کم بولتے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو بات کہنے کے بجائے اسے سنبھال کر رکھتے ہیں۔ ان کے سینے میں کئی جملے تھے جو کبھی مکمل نہیں ہوئے۔ شاید اسی لیے وہ خاموشی کے عادی ہو گئے تھے، یا خاموشی ان کی عادی ہو گئی تھی۔

اسی گھر کی ایک دراز میں ایک خط رکھا تھا۔ وہ خط کسی خاص دن کی یاد نہیں تھا، بلکہ ایک ایسے دن کا وعدہ تھا جو کبھی آیا نہیں۔ خط اُس وقت آیا تھا جب رحمان گھر سے نکلا تھا۔

رحمان.... غفور چاچا کا بیٹا.... گھر سے نہیں، ایک فیصلے سے نکلا تھا۔ اس نے شہر جانے کا کہا تو غفور چاچا نے کچھ نہیں کہا۔ بعض رضامندیاں زبان سے نہیں، خاموش رہ کر دی جاتی ہیں۔ ماں نے روتے ہوئے بیٹے کے کپڑوں میں دعا سی دی تھی، اور باپ نے دروازہ بند کر دیا تھا.... آہستہ، جیسے وقت کو جگانا نہیں چاہتے ہوں۔ اسی شام ڈاکیے نے خط دیا تھا۔ لفافہ ہلکا تھا، مگر ہاتھ میں لیتے ہی بھاری ہو گیا تھا۔ غفور چاچا نے خط کھولا نہیں۔ انہوں نے اسے دراز میں رکھا، اور دراز کو بند نہیں کیا.... بس اتنا بند کیا کہ خط سانس لیتا رہے۔

سلیمہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

سلیمہ..... جو اس گھر کی واحد گواہ تھی اور غفور چاچا کی اکلوتی بیٹی تھی..... سمجھ گئی تھی کہ اس دراز میں کاغذ نہیں، وہ باتیں ہیں جو باپ اور بیٹے کے بیچ کبھی پوری نہ ہو سکیں۔ وہ جانتی تھی کہ کچھ سوال اگر وقت پر نہ پوچھے جائیں تو وہ وراثت بن جاتے ہیں۔

وہ کئی بار باپ کے پاس بیٹھی، کئی بار بولتے بولتے رک گئی۔

آخر ایک دن اس نے پوچھ ہی لیا ''ابا، اگر وہ خط کھل جائے تو کیا بدل جائے گا؟''

غفور چاچا نے جواب نہیں دیا۔ اور حقہ پیتا رہا ....

انہوں نے صرف یہ کہا'' کچھ چیزیں بدلنے کے لیے نہیں ہوتیں، بچانے کے لیے ہوتی ہیں۔''

سال گزرتے گئے۔ دراز پر گرد جمع ہوتی رہی۔ اور خط.... اپنے اندر وقت جمع کرتا رہا۔

رحمان برسوں بعد لوٹا۔ وہ لوٹا تو اس کے ہاتھ خالی تھے، مگر آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ شہر نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا، مگر یہ نہیں سکھایا تھا کہ واپس آ کر کہاں کھڑا ہونا ہے۔ ماں کی قبر پر کھڑے ہو کر وہ دیر تک خاموش رہا، جیسے مٹی سے اجازت مانگ رہا ہو۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر دراز پر ٹھہر گئی۔ وہی دراز۔ وہی خط۔ ''ابا، وہ خط...''

یہ جملہ پورا نہ ہو سکا۔

غفور چاچا نے پہلی بار رحمان کو غور سے دیکھا۔ پھر آہستہ سے بولے'' یہ خط اگر پہلے کھل جاتا تو شاید ہم دونوں بدل جاتے۔ اور اگر اب کھلا... تو شاید کچھ بھی باقی نہ رہے۔''

اس رات سلیمہ نے خواب دیکھا۔

اس نے دیکھا کہ دنیا کے سب لوگ اپنے اپنے ہاتھوں میں بند خطوط لیے کھڑے ہیں۔ کسی نے بھی کوئی خط نہیں کھولا۔ سب انتظار کر رہے تھے.... کسی ایسے دن کا جو خط سے بڑا ہو۔

صبح ہوئی تو غفور چاچا نہیں اٹھے۔ گھر میں عجیب سی خاموشی تھی.... ایسی خاموشی جس میں آوازیں بھی محتاط ہو جاتی ہیں۔ سلیمہ نے دراز کھولی۔ خط نکالا۔ رحمان قریب آ گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ مگر خط پھر بھی نہیں کھولا گیا۔ غفور چاچا چلے گئے۔ رحمان واپس شہر چلا گیا۔ اور سلیمہ..... اس گھر کی آخری سانس.... خط کو ایک نئے لفافے میں رکھ کر الماری کے اوپر رکھ آئی۔ کیونکہ اب وہ جان گئی تھی کچھ خطوط پیغام نہیں ہوتے، وہ ہمارے اندر کے فاصلوں کا ثبوت ہوتے ہیں۔ اور کچھ خاموشیاں.... پڑھی نہیں جاتیں، نبھائی جاتی ہیں۔ خط.... ابھی تک نہیں کھلا تھا۔

اور شاید، یہی اس کا مطلب تھا۔

☆☆

رسمِ رونمائی

سبزار پور کے ایک کہنہ مشق کے شعری مجموعہ کی رسم رونمائی کل شہر کے مشہور سہگل ہال میں انجام دی جائے گی......میں نے بھی اعلان ریڈیو پر سُنا تو پوری رات کپڑے دھونے اور استری کرنے میں گُزری......

صبح ہوتے ہی میں نے خان ڈریس کے اوپر کشمیری صدری پہن لی اور شہر کی طرف روانہ ہو گیا......حال کچھا کھچ بھرا ہوا تھا، مگر کئی لوگوں کی صدری کا بخار میری طرح سے پہلے ہی اتر چُکا تھا کیونکہ انہیں بھی میری طرح سیٹ نہیں ملی تھی اور بالکونی پر کھڑے ہی گزارہ کرنا پڑھا......کتاب کی رسم رونمائی انجام دی گئی مگر کتاب صرف انہی معزز حضرات کو ملی جو سٹیج پر تھے......سامعین کو یہ کہا گیا کہ وہ باہر لگے سٹال سے کتاب خریدیں......

اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بِنا لوگوں نے چہ مہ گویاں شروع کی......اِس کتاب میں اچھی شاعری نہیں ہے، فضول میں یہاں وقت گُزارنا پڑا......ارے معیار بھی ٹھیک نہیں ہے......لوگ یہ کہہ کر رفو چکر ہو گئے میں بھی دُم دبا کر بھاگ گیا اور بھرا پڑا حال سُنسان ہو گیا......کئی سال تک شاعر صاحب اسی خیال میں تھے کہ کوئی نہ کوئی کتاب خریدے گا......مگر جب قرضداروں نے قرضہ اتارنے کو کہا تو اس کو سبھی کتابیں کباڑی کو خریدنی پڑی اور ان کا حال بے حال ہو گیا......

☆☆

اینٹ کا جواب پتھر سے

ایک دن پہاڑ کا پانی جھیل کے پانی سے ملنے گیا راستہ معلوم نہیں تھا مگر پتہ پوچھ پوچھ کر ایک دن جھیل میں پہنچ گیا۔ جھیل کے پانی نے پہاڑ کے پانی کی خوب آؤ بھگت کی۔ مگر پہاڑ کا پانی جھیل کے پانی کو دیکھ کر حیرت میں پڑا۔ اس نے جھیل کے پانی سے پوچھا۔ بھائی تم تو پہاڑ پر صاف شفاف اور اچھی زندگی گزارتے تھے یہاں آکر آپ بیمار کیوں ہیں؟ جھیل کے پانی نے جواب دیا بھائی اب تو آپ بھی آئے ہیں کچھ دن انتظار کیجئے اس کے بعد دیکھئے کہ کیا ہوگا......

مگر پہاڑ کے پانی نے اصرار کیا کہ نہیں بھائی مجھے اسی وقت بتا دیجئے کہ ماجرا کیا ہے؟ تو جھیل کے پانی نے کہا کہ بھائی جب میں آپ سے جدا ہوگیا تو جنگل کے باہر آتے ہی انسان مجھ پر گندگی پھینکنے لگے۔ کوئی پالیتھین ڈالتا ہے تو کوئی اپنے گھروں سے کوڑا کرکٹ لاکر پھینک دیتا ہے کوئی گٹر کا پانی تو کوئی بیت الخلا کا پانی ملا دیتا ہے۔ اب میں بیمار ہوں مجھے قے آرہے ہیں اور میرا جگر، گردے اور پھیپھڑے خراب ہوگئے۔ میں روز سورج کی کرنوں سے نہاتا تھا اور اپنا تن من صاف کرتا تھا اب انہوں نے مجھے نلوں کے ذریعے سے اپنے گھر کی ٹینکیوں میں قید کیا اور میں اب گندہ ہی رہتا ہوں۔

تو کیا آپ نے کچھ نہیں کیا؟ جھیل کے پانی نے جلدی سے پوچھا۔

ہاں کیا!!! میں نے بھی ان کو انہی بیماریوں میں مبتلا کیا جن بیماریوں میں انہوں نے مجھے

کیا۔ان کو گھروں میں اسی طرح قید کیا جس طرح انہوں نے مجھے کیا۔

اچھا کیا!! آج سے میں بھی یہیں رہ کر آپ کی مدد کروں گا اور اینٹ کا جواب پتھر سے دوں گا.... ٹھیک ہے بھائی فی الحال آپ اپنے کپڑے بدل دیجئے، جھیل کے پانی نے کہا....

☆☆

کفن چور

نثار چوروں کا سرغنہ تھا اکثر چوریاں کرواتا تھا وہ دکھاوے میں ایک اعلیٰ اخلاق اور پارسا نظر آتا تھا اور اس کی پارسائی پر کوئی بھی شک نہیں کرتا تھا چوروں کا یہ گروہ لوگوں کے گھر اور جیب صاف کرنے کے ساتھ ساتھ گاڑیاں، زیورات اور مال مویشی تک چوری لے جانے کی مہارت رکھتے تھے۔ان کی مہارت اور ہاتھوں کی صفائی اتنی مشہور تھی کہ کسی کے بغل سے اگر بچہ بھی غائب کر لیتے تھے تو اس کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی.... اب لوگ یہ دیکھ کر تنگ آچکے تھے پولیس بھی چوکنا تھی مگر بے سود.... کیا کریں آج فلاں کا گھر صاف ہوا۔کل فلاں کا گھر... جو لوگ تشویش کر رہے تھے ان میں نثار بھی شامل ہوتا تھا اور کہہ رہے تھے کہ چلئے میری بیوی کے زیور تو بچ گئے۔میں نے ان کو فلاں والی الماری میں رکھے ہوئے ہیں۔صبح اٹھتے ہی اس گھر کے مکین ہائے رے چوری ہوگئی ہے کے نعرے بلند کرتے تھے پولیس حرکت میں آئی اور لوگوں نے اپنے گھروں میں سی ٹی وی کیمرے نصب کروائے۔

اب ان چوروں کا جینا حرام ہوگیا جس کی زد میں نثار بھی آگیا اس کی زندگی بھی متاثر ہوگئی اور تنگی اتنی آگئی کہ اب ایک وقت کی روٹی بھی میسر نہیں ہوتی تھی کیونکہ اس کو محنت کرنے کی عادت چھوٹ گئی تھی۔رورو کے بچوں کا برا حال ہوگیا تھا اب ان سے رہا نہ جاتا تھا مگر اپنے ہاتھوں کو کسی کے آگے پھیلانا نہیں چاہتا تھا۔ایک روز گاؤں کے ایک امیر زادے کا انتقال ہوگیا....

ہاں اس کا کفن تو مہنگا ہی ہوگا آج رات کو میں اس کا کفن ہی چراؤں گا اور مہنگے داموں بیچ کر اپنے بچوں کو روٹی کھلاؤں گا۔

اس رات بچوں اور بیوی کو سُلا کر خود گھر سے نکل گیا.... ہاتھوں میں ایک بیلچہ لے کر قبرستان کی طرف نکلا۔ ادھر ادھر دیکھ کر بیلچہ سے قبر سے مٹی ہٹانے لگا مٹی ہٹائی اور اب اس میت کے جسم سے کفن ہٹانے لگا.... جوں ہی کفن اٹھانے لگا تو اس میت نے نثار کے ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا..... ذرا رُکیۓ جلدی نہ کیجئے....

کککک کیا آپ زندہ ہیں؟

نہیں میں زندہ نہیں ہوں بلکہ میں مرا ہوا ہوں اور آپ کی طرح میرا ضمیر بھی مر چکا تھا میں بھی لوگوں کا کفن چرا لیتا تھا اور آج حالات ایسے ہوئے کہ میرا بھی کفن چرایا گیا اور میں اس قبر میں اکیلا اور بُرہنہ رہ گیا ہوں۔ آج آپ میرا کفن لے لیجیے کل آ کر کوئی آپ کا کفن بھی لے جائے گا اور آپ بھی برہنہ رہ جائیں گے اور آج میرے گھر والے میری قبر پر آ کر مجھے بُرہنہ پائیں گے اور کل تمہارے گھر والے تم کو بُرہنہ دیکھیں گے.... لے جائیے میرا کفن لے جائیے!

نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا.... ایسا ہی ہوگا اُس میت نے کہا...

مہربانی کر کے میرا ہاتھ چھوڑ دیجئے۔۔ چھوڑ دیجئے۔۔۔ چھوڑ دیجئے۔۔ اور زور سے اپنے ہاتھ کو چھڑا کر بھاگنے لگا.... گھر پہنچتے ہی گیٹ کے زور سے گر پڑا اور کہنے لگا کہ میں توبہ کرتا ہوں میں توبہ کرتا ہوں..... ادھر مؤذن نے آواز دی اور اس کو بیوی نے جگایا اور کہا کہ آپ نیند میں کیا بڑبڑا رہے تھے جب وہ بیدار ہوا تو دیکھا کہ بستر بھی پسینے سے بھیگ چکا تھا اور فوراً اٹھا اور منہ ہاتھ دھو کر اللہ کا شکر کرنے لگا

☆☆

کھیل شروع ہوا......مگر!

شبیر اور سلیمان آپس میں ہمسایہ تھے۔دوستی ایسی تھی کہ لگتا تھا کہ وہ جڑواں بھائی تھے۔ان کی دوستی کے چرچے دور دور تک پھیلے تھے۔شبیر کے گھر میں مرغا ذبح ہوتا تھا تو سلیمان کے گھر والوں کو دعوت دی جاتی تھی۔سلیمان کے گھر میں اچھا سالن پکتا تھا تو دونوں خاندان مل بانٹ کر کھاتے تھے۔اللہ تعالیٰ نے دونوں کو ایسی بیویاں دی تھیں کہ دونوں ایک دوسرے کے کپڑے پہنتے تھے شادی بیاہ پر دونوں ایک ساتھ جایا کرتی تھیں۔کیا آپ آپس میں سگی بہنیں ہیں؟ ایسے سوالات ہر وقت ان سے پوچھے جاتے تھے۔دونوں کا ایک ایک بیٹا تھا شبیر کے بیٹے کا نام عُبید اور سلیمان کے بیٹے کا نام عابد رکھا گیا تھا۔دونوں کا پہناوا ایک جیسا ہوتا تھا۔ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے اور ایک ساتھ اسکول جایا اور آیا کرتے تھے۔اتوار کا دن تھا۔عبید اور عابد کی چھٹی تھی وہ صحن میں کرکٹ کھیل رہے تھے.... آج میری گیند ہوگی اور بلا ہوگا عبید نے عابد سے کہا.....

چلو ٹھیک ہے جو آپ کی مرضی مگر پہلی بیٹنگ میں کروں گا عابد نے کہا.... نہیں پہلی بیٹنگ میری ہوگی۔عبید نے کہا..... نہیں پہلی بیٹنگ میری ہی ہوگی۔عابد اپنے آپ پر بضد رہا....جب عبید نے نہیں مانا تو عابد صحن کے ایک کونے میں جا کر روٹھ گیا اور عبید دوسرے کونے میں....ان کا یہ ماجرا دونوں کی مائیں اپنی اپنی مکان کی کھڑکیوں سے دیکھ رہی تھیں اور ایک دوسرے سے مسکراتے ہوئے اشارے اشارے میں کچھ کہہ رہی تھیں۔دونوں نے

کھڑکیاں بند کیں اور صحن میں اُتر گئیں۔عبید کی ماں نے عابد کو پکڑا اور عابد کی ماں نے عبید کو پکڑ کر دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا اور ہنستے ہنستے روبرو کر کے عبید کی ماں نے کہا کہ پہلے عابد ہی کھیلے گا اور دونوں کی مائیں اپنے اپنے گھر جا کر کام میں مشغول ہوئیں۔بچوں نے اب کھیلنا شروع کیا.... کھیل تو شروع ہوا مگر دونوں کی رنجشیں دور نہیں ہوئی تھیں۔وہ دونوں ایک دوسرے سے ایک نہ ایک بہانہ بنا کر لڑنے لگے بات یہاں تک پہنچی کہ وہ گالی گلوچ تک اتر آئے۔عبید نے گیند ڈالی تو عابد نے زور سے اس کو مارا اور گیند جا کر عبید کے سر سے ٹکرائی.... ایسا آج تک کئی بار ہوا تھا مگر آج تو حالات نے کروٹ ہی بدلی۔عبید کو گیند کیا لگی تو انہوں نے چلانا چیخنا شروع کیا۔اُدھر عبید کی ماں نے آ کر عابد کو ایک تھپڑ رسید کیا۔تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ عابد کی ماں کے کانوں تک آواز پہنچی۔اب دونوں بچے رو رہے تھے....

عابد کی ماں جلدی جلدی آئی اور عابد کو گلے سے لگایا اور دیکھا کہ اس کے گال پر انگلیوں کے نشان نمودار تھے سُرخ نشان! اُس کی آنکھوں میں آنسوں آ گئے۔

جس نے عابد کو تھپڑ ماری اس کے ہاتھ میں کیڑے پڑیں اس نے کہا۔

اور جس کی گیند نے میرے عبید کو یہ حال کیا اس کی ایسی تیسی، وہ جوان مرگ ہو جائے عبید کی ماں نے کہا ایسا لگتا تھا کہ وہ اور کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس کو عابد کی ماں نے ایسا دھکا مارا کہ وہ دو گز کی دوری پر گر پڑی.... مگر وہ بھی کسی سے کم نہیں تھی اس نے اُٹھتے ہی ہاتھ میں ایک ڈنڈا اُٹھا کر عابد کی ماں کے سر پر مارا کہ خون بہنے لگا.... کھیل تو کرکٹ میچ سے بھی دلچسپ تھا۔کبھی عبید کی ماں جیتتی تھی تو کبھی عابد کی ماں..... اب یہ میچ گاؤں کی سبھی عورتیں دیکھنے کیلئے آئیں....

ہائے یہ کیا ہوا عابد اور عبید کی ماں آپس میں لڑ رہی ہیں۔لوگ انگشت بدنداں رہے۔دو سگی

بہنیں آپس میں لڑ رہی ہیں۔ گاؤں کی عورتیں ایک دوسرے سے کہہ رہی تھی۔ کسی نہ کسی طرح گاؤں کی کچھ بزرگ عورتوں نے اس وقت معاملہ سلجھایا مگر..... معاملہ اُس وقت زور پکڑنے لگا جب شبیر اور سلیمان شام کے وقت اپنے گھر پہنچے دونوں کی بیویوں نے ان کے کان بھرے اور اب وہ میدان جنگ میں ایسے اترے کہ لگتا تھا دو ملکوں کی جنگ شروع ہوگئی۔ بم نہیں بھرسے البتہ پتھر تو بھرسے.... معاملہ کورٹ تک پہنچا.... وکیلوں پر لاکھوں روپے خرچ ہوئے.... تاریخ پر تاریخ.... وہ نہ اب گھر والوں کی طرف دھیان دیتے تھے نہ اپنے بچوں کی پڑھائی پر.... کھیت برباد.... باغات تباہ.... اب وہ کسمپرسی کی حالت میں رہنے لگے.... اب ان کے گھروں کے بیچ میں اونچی اونچی دیواریں کھڑی تھیں اور وہ ایک دوسرے کے صحن کی طرف تک نہیں دیکھتے تھے.... عید کا تہوار تھا ہر طرف چھل پہل تھی مگر یہ دونوں گھرانے اپنے اپنے گھروں میں قید تھے ان کی زندگیاں اب وبال بن چکی تھی... عابد عابد یہ دیکھو میں آپ کیلئے کیا لایا ہوں اس کے ہاتھ میں ایک گڑیا تھی .... عبید نے عابد سے کہا.... عابد کے ہاتھ میں بھی ایک چھوٹی سی گاڑی تھی۔ میں یہ آپ کیلئے یہ لایا ہوں اور ایک دوسرے سے مست خوشی سے باتیں کرتے تھے ادھر شبیر اور سلمان بھی ان کا پیار دیکھ کر آگے آئے اور ایک دوسرے کو گلے لگایا اور رونے لگے.... ان کا یہ ماجرا دیکھ کر ان کی بیویاں بھی آگے آئیں اور انہوں نے بھی آپسی رنجش دور کی۔ دونوں نیکورٹ کیس واپس لیا اور گھروں کے بیچ کھڑے اونچے دیوار کے ساتھ ساتھ اپنے انا کی دیوار کو بھی گرا دیا اور آپس میں اُسی طرح سے زندگی گزارنے لگے جس طرح سے وہ چار سال پہلے گزارتے تھے۔ ان کی گھریلو زندگیاں سُدھرنے لگی اور ان کے مالی حالات بھی ٹھیک ہونے لگے اور آپس میں ہنستے ہنستے کہتے رہتے کہ آخر ہم ایک ہیں۔

☆☆

سرد آہیں اور... بس!

جھاڑے کا موسم تھا۔ مگر یہ وہ سردی نہیں تھی جو موسم کی تبدیلی سے آتی ہے۔ یہ وہ سردی تھی جو نسلوں کے بیچ خاموشی سے منتقل ہوتی ہے.... باپ کے ہاتھوں سے بیٹے کے ہاتھوں میں۔ اور خوابوں سے حقیقت کے چہرے پر برف گر رہی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے آسمان نے زمین کے زخم دیکھ لیے ہوں اور اب رو رہا ہو۔

رمضان اپنے دو بچوں کے ساتھ انگیٹھی کے گرد بیٹھا تھا۔

انگیٹھی.... جو کبھی آگ دیتی تھی، اب صرف دھواں دیتی تھی۔

بچے ہاتھ آگ کی طرف بڑھاتے، پھر پیچھے کھینچ لیتے۔

غربت بچوں کو جلد سکھا دیتی ہے کہ ہر چیز کو چھونا ضروری نہیں، کچھ چیزیں بس دور سے دیکھی جاتی ہیں۔ عائشہ آتش دان کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے نکلنے والی پھونک میں نہ دم تھا، نہ شکوہ..... بس عادت تھی، جیسے برسوں سے یہی عمل اس کی عبادت ہو۔

"سنتے ہو..."

یہ جملہ سوال نہیں تھا،

یہ ایک آزمائش تھی۔

"بچے سردی سے کانپ رہے ہیں...

اور میں نے سوچا تھا کہ اس سال شاید میرے لیے بھی گرم کپڑوں کا ایک جوڑا آ جائے

گا...‘‘

رمضان نے کوئی جواب نہیں دیا۔

جو آدمی زندگی میں بہت کچھ ہار چکا ہو، وہ بعض سوالوں کا جواب خاموشی میں دفن کر دیتا ہے۔خاموشی کے اسی قبرستان میں سارہ زندہ تھی۔سارہ.... جو رمضان کی زندگی میں کسی بہار کی طرح نہیں، بلکہ ایک ادھوری سردیوں کی طرح آئی تھی۔وہ کنویں کے پاس کھڑی ہوتی، رسّی اس کے ہاتھ میں ہوتی اور پانی سے زیادہ رمضان کی آنکھوں میں جھانکتی۔وہ ہنستی تو لگتا جیسے وقت رک گیا ہو۔وہ بولتی تو رمضان کے اندر کی خاموشی بولنے لگتی۔

کنواں.... جو صرف پانی نہیں دیتا تھا، وہ ان دونوں کو ایک دوسرے کا عکس بھی دکھاتا تھا۔

مگر عکس ہمیشہ سچ نہیں ہوتے۔

ستار خان گاؤں کا نمبر دار تھا، اور نمبر دار ہونا صرف اختیار نہیں،

یہ محبت کا دشمن ہونا بھی ہے۔

’’محبت پیٹ نہیں بھرتی رمضان!‘‘.... یہ جملہ ستار خان نے کہا تھا، مگر یہ پورے سماج کا منشور تھا۔’’ہماری بیٹی ہے، کوئی خواب نہیں جو تم جیسے مزدور کے حوالے کر دی جائے۔‘‘

سارہ اس دن خاموش رہی۔

اس کی خاموشی میں بغاوت تھی، مگر بغاوت کے پاس زبان نہیں تھی۔شہر سے آیا ہوا رشتہ سونے میں لپٹا ہوا فیصلہ تھا۔ستار خان نے ہاں کہی اور اسی لمحے رمضان کی زندگی میں ہمیشہ کے لیے سردی اتر گئی۔محبت کو شادی کے کاغذوں میں نہیں، خاموشی کے لفافوں میں بند کر دیا گیا۔اس دن کے بعد رمضان نے ہنسنا نہیں چھوڑا.... اس نے ہنسنے کی وجہ کھو دی۔وقت گزرتا رہا۔سارہ شہر کی عورت بن گئی۔اور رمضان.... رمضان ایک موسم بن گیا جو ہر سال

آتا تھا۔اور ہر سال زیادہ سرد ہو جاتا تھا۔

آج، جب عائشہ انگیٹھی کے سامنے بیٹھی ہے، رمضان کو لگتا ہے کہ آگ نہیں، یادیں بجھ رہی ہیں۔اسے لگتا ہے کہ سارہ اب بھی کنویں کے کنارے کھڑی ہے، اب بھی بلا رہی ہے.... مگراب کنواں بھی پانی نہیں دیتا، صرف گہرائی دیتا ہے۔

ادھر سارہ ریشم کے پردوں میں سانس لیتی ہے، مگر کبھی کبھی اسے بھی یوں لگتا ہے کہ کسی نے اس کے اندر ایک انگیٹھی جلادی ہے جو گرم نہیں کرتی، بس جلاتی ہے۔عائشہ خاموش ہو چکی ہے۔

بچے سو چکے ہیں۔انگیٹھی میں آگ مر چکی ہے۔رمضان اٹھتا ہے، باہر جاتا ہے، برف اس کے قدموں کو ڈھانپ لیتی ہے۔وہ آسمان کی طرف دیکھتا ہے اور پہلی بار سوچتا ہے کہ شاید سردی آسمان سے نہیں گرتی یہ انسانوں کے فیصلوں سے جنم لیتی ہے۔وہ ایک لمبی سانس لیتا ہے۔سانس بھاپ بن کر اڑ جاتی ہے۔اور پیچھے بس ایک چیز رہ جاتی ہے۔

سرد آہیں... اور بس۔

☆☆

خون کی ہولی!

یہ کہانی پرانی ہے ... اُس وقت کی، جب ہمارے گھر اُجڑ گئے تھے۔

ہر سمت آزادی کے نعروں کی گونج تھی۔ نعرے اتنے بلند تھے کہ سچ دب گیا۔ کانوں کے پردے پھٹنے کو آتے تھے، مگر جو چیخیں دلوں کے اندر اٹھتی تھیں، وہ کسی کو سنائی نہ دیتی تھیں۔ ہڑتال، کرفیو، خوف، افواہیں، اور بے یقینی.... کیا کچھ نہیں دیکھا ہم نے۔ اور پھر ایک دن ہمیں بتایا گیا کہ ہمیں جانا ہوگا۔ فوراً ... ابھی۔ اسی رات۔ نہ کسی نے یہ بتایا کہ قصور کس کا ہے، نہ یہ کہ ہم نے کیا گناہ کیا ہے۔ بس اتنا کہا گیا کہ اب یہ زمین تمہاری نہیں رہی۔ پتہ نہیں نفرت کس نے بوئی تھی، مگر اس کی فصل ہم سب نے کاٹی۔ دیکھتے ہی دیکھتے، سارے پنڈت اپنے کشمیر، اپنے وطن کو چھوڑ کر نکلنے پر مجبور ہو گئے.... ایسے جیسے صدیوں سے جمی ہوئی جڑیں ایک ہی جھٹکے میں اکھاڑ دی گئی ہوں۔

یہ سب رام کرشن اپنے پوتوں کو سنا رہا تھا۔ بس کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا رام کرشن کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ پہاڑ آہستہ آہستہ قریب آ رہے تھے، مگر اس کا دل ہر موڑ پر پیچھے رہ جاتا تھا۔

رام کرشن ...... جو کبھی اپنے ہی وطن میں وقار اور خودداری کی زندگی جیتا تھا.... آج پردیس میں ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ بن چکا تھا۔ جسم زندہ تھا، مگر زندگی بہت پیچھے کہیں چھوٹ گئی تھی۔ لگ بھگ پانچ دہائیوں بعد وہ اپنے پوتوں کے ساتھ کشمیر لوٹ رہا تھا۔ یہ واپسی کسی

جشن کی طرح نہیں تھی، بلکہ ایک بوڑھے سوال کی مانند تھی جو برسوں سے اس کے سینے میں دفن تھا۔ پوتے خوش تھے۔

ان کے لیے یہ سفر ایک کہانی تھی، ایک مہم.... جیسے دادا کے لفظوں میں بند کوئی پرانا قصہ اب حقیقت بننے جا رہا ہو۔ یشونت، جو سب سے چھوٹا تھا، بولا ”دادا جی، کیا ہمارے اپنے گھر تھے؟“

رام کرشن چونک سا گیا۔ اس سوال میں سادگی تھی، مگر اس کے جواب میں صدیوں کا بوجھ۔

”ہاں بیٹا...“ اس نے آہستہ کہا۔

”ہمارے اپنے گھر تھے۔ مٹی کے نہیں، محبت کے۔ کھیت کھلیان تھے، جن میں ہم پسینہ بہاتے تھے۔ چار پا تھا، جہاں شام کو بیٹھ کر باتیں ہوتیں۔ درخت تھے.... سیب کے، اخروٹ کے... اور ان کی چھاؤں میں ہم تھکن اتارتے تھے۔ اس نے لمحہ بھر کو سانس روکی۔ ”اور ہمسائے تھے...“

لیلیٰ نے فوراً پوچھا: کیسے ہمسائے دادا جی؟

رام کرشن کی آنکھوں میں ایک چہرہ تیر گیا.... دھاگے کی طرح باریک، مگر مضبوط۔ ”ہمارا ایک ہمسایہ تھا... عبدالرحمٰن۔ صبح کی اذان اس کے صحن سے اٹھتی تھی، اور شام کو ہمارے گھر کی گھنٹی بجتی تھی۔ عید پر سویاں ہمارے یہاں آتیں، دیوالی پر ہمارے چراغ اس کے آنگن کو روشن کرتے۔ ہم نے کبھی یہ نہیں پوچھا کہ خوشی کس مذہب کی ہے۔“ پوتے خاموش ہو گئے۔ شاید وہ پہلی بار کسی ایسی دنیا کے بارے میں سن رہے تھے جو اب صرف یادوں میں رہ گئی تھی۔ بس گاؤں میں داخل ہوئی۔

وہی گاؤں، جہاں رام کرشن نے آنکھ کھولی تھی۔ وہی راستے، جن پر اس نے ننگے پاؤں دوڑنا سیکھا تھا۔ وہی فضا.... مگر اب اجنبی۔ جیسے ہی وہ اپنے گھر کے مقام پر پہنچے، رام کرشن کے

قدم رک گئے۔ وہ مکان، جو اس نے جوانی میں اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا، اب ایک کھنڈر تھا۔ نہ دروازہ، نہ کھڑکی۔ دیواریں جھکی ہوئی تھیں، جیسے برسوں سے کسی کے سوال سن سن کر تھک گئی ہوں۔

رام کرشن آگے بڑھا۔ اونچی گھاس اس کے پاؤں سے لپٹ رہی تھی، جیسے پہچان رہی ہو۔ نہ عبدالرحمٰن کا گھر تھا، نہ اس کی آواز۔ خاموشی اتنی گہری تھی کہ سانس بھی ڈرتا تھا۔ اچانک رام کرشن کے کانوں میں ہنسی گونجی۔ وہ چونکا۔ مڑ کر دیکھا.... کوئی نہیں۔ اس نے آنکھیں بند کیں۔ اسے لگا جیسے عبدالرحمٰن کہہ رہا ہو۔ ''رامو بھائی، یہ زمین کسی کی نہیں ہوتی... زمین صرف امانت ہوتی ہے۔'' رام کرشن کے قدم لڑکھڑا گئے۔ وہ زمین پر بیٹھ گیا، پھر گر پڑا۔ وہ مٹی کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اپنے سر پر ملتا رہا، جیسے کھوئی ہوئی چیز واپس مانگ رہا ہو۔

''یہ میرے وطن کی مٹی ہے... محبت کی مٹی... اس پر نفرت کس نے بو دی؟ کس کی نظر لگ گئی اس پر؟'' پوتے دور کھڑے تھے۔ وہ پہلی بار سمجھ رہے تھے کہ وطن صرف نقشے پر لکھی لکیر نہیں ہوتا۔ چند دن بعد رام کرشن خاموش ہو گیا۔ ہمیشہ کے لیے۔ اسی زمین میں اس کا وہ سنسکار کیا گیا.... اُس مٹی میں جس سے وہ ایک دن بے دخل کیا گیا تھا۔ رات کو، جب گاؤں پر دھند اترتی ہے، لوگ کہتے ہیں کہ کھنڈر کے پاس ایک بوڑھا سایہ بیٹھا دکھائی دیتا ہے۔ نہ وہ کسی سے شکوہ کرتا ہے، نہ کسی پر الزام رکھتا ہے۔ بس مٹی کو دیکھتا ہے، اور ہوا میں ایک سوال چھوڑ دیتا ہے.... ''اگر نفرت ایک بیج تھی، تو اس کی فصل ہم سب نے کیوں کاٹی؟ اور اگر وطن ماں ہوتا ہے، تو پھر ماں سے بچھڑنے کا جرم آخر کس کے نام لکھا جائے؟''

☆☆

یاد ہے نا!

ندیاں... محض بہتے پانی کا نام نہیں ہوتیں۔ کبھی کبھی ندی انسان کے اندر بہنے لگتی ہے.... یادوں کی صورت، سوالوں کی صورت، اور کبھی کبھی ایسے سچ کی صورت جسے عقل ماننے سے انکار کر دیتی ہے مگر دل جھٹلا نہیں پاتا۔ میری زندگی میں بھی ایک ندی ہے۔ اور اس ندی کے کنارے ایک یاد۔ میری پہلی محبت۔

میں جب بھی ندی کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا شاہ پور کی طرف اترتا تھا تو یوں محسوس ہوتا جیسے زمین مجھے پہچان رہی ہو۔ شاہ پور ...... ایک ایسا گاؤں جو سال کے باقی دنوں میں خاموش رہتا، مگر جھاڑے کے موسم میں اچانک جاگ اٹھتا۔ میلہ لگتا، اور میلے کے ساتھ انسانوں کے اندر دبی ہوئی۔

خواہشیں بھی باہر نکل آتیں کھلونوں کی آوازیں، تلہ مونجہ کی خوشبو، پکے ہوئے کلیجے کا دھواں، اور چہروں پر عارضی مسکراہٹیں.... سب کچھ ایک ہی دن کے لیے۔ اس روز بھی میلہ لگا تھا۔ مجھے جانا تھا۔ مگر میں کسی الجھن میں پڑ گیا۔ جب نکلا تو گاؤں خالی تھا۔ سب لوگ جا چکے تھے، جیسے وقت نے مجھے پیچھے چھوڑ دیا ہو۔ میں اکیلا ندی کے کنارے چل پڑا۔ پانی خاموش تھا، مگر اس خاموشی میں ایک عجیب سی سماعت تھی۔ اسی لمحے... وہ سامنے آئی۔ دوشیزہ....

یوں نہیں لگتا تھا کہ وہ چل رہی ہے، بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ زمین خود اس کے

قدموں کے نیچے سرک رہی ہو۔ گھنگریالی زلفیں، بادامی آنکھیں، اور چہرہ.... جیسے کسی دعا کا آخری مصرع۔

''کہاں جانا ہے؟''اس نے پوچھا۔''

میلے میں... ''میں نے کہا، مگر آواز میری نہیں لگ رہی تھی۔''

مجھے بھی جانا ہے۔ وہ مسکرائی۔ ''کیا میں تمہارے ساتھ چل سکتی ہوں؟''

اس سوال میں اجازت کم، فیصلہ زیادہ تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا۔ میں رک گیا۔ مگر جب اس کی انگلیوں نے میرا ہاتھ چھوا، تو جسم میں ایسی کپکپاہٹ دوڑ گئی جیسے میں اچانک اپنے آپ سے باہر نکل آیا ہوں۔ جھاڑے کا موسم تھا، مگر پیشانی پر پسینہ یوں ابھرا جیسے گرمی اپنے تمام اصول توڑ چکی ہو۔ میں بھاگ سکتا تھا۔

مگر انسان ہمیشہ وہیں نہیں بھاگتا جہاں خطرہ ہو..... کبھی کبھی وہ وہاں رک جاتا ہے جہاں سوال ہو۔ راستے میں چوراہا آیا۔

میں نے دائیں طرف اشارہ کیا.... وہی پرانا راستہ، جسے میں جانتا تھا۔ وہ رکی۔ پھر آہستہ سے بولی ''نہیں... ہم اس راستے سے جائیں گے۔ یہ نزدیک ہے۔ کیا تم تھک گئے ہو؟''

میں واقعی تھک گیا تھا.... چلتے ہوئے نہیں، سوچتے ہوئے۔ ہم ایک قدیم پتھر پر بیٹھ گئے۔ وہ پتھر جس کے بارے میں گاؤں میں کہا جاتا تھا کہ اس کے نیچے جن بستے ہیں۔ کہ یہاں سے لوگ غائب ہو جاتے ہیں۔ کہ ایک بارات یہاں سے گزری اور پھر کبھی واپس نہ آئی۔ کچھ جگہیں صرف زمین کا حصہ نہیں ہوتیں، وہ یادوں اور انجام کا سنگم ہوتی ہیں۔ دوشیزہ نے اپنے چھوٹے سے تھیلے سے سفید سی مٹھاس نکالی۔

''کھاؤ...''اس نے کہا۔

میں نے کھایا ..... اور پھر سب کچھ بدل گیا۔ میں کسی اور جگہ تھا۔ ایک ایسا شہر جہاں چہرے

انسانوں کے نہیں، اعمال کے تھے کچھ چہرے سفید، نورانی، پرسکون۔ کچھ سیاہ، بگڑے ہوئے، خوف سے بھرے۔

''یہ کون ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولی ''یہ وہ ہیں جنہوں نے خود کو دوسروں میں تقسیم کر دیا۔ یہ نیکیوں کی صورتیں ہیں۔'' پھر اس نے سیاہ چہروں کی طرف دیکھا ''اور یہ وہ ہیں جنہوں نے دوسروں کو کھا کر خود کو بڑا کیا۔ یہ ان کے اعمال ہیں.... ان کا اصل چہرہ۔'' ہم ایک دیوار تک پہنچے۔ دائیں طرف شکر کے نعرے تھے، بائیں طرف معافی کی چیخیں۔ اور اچانک ایک خشمناک نگاہ مجھ پر پڑی۔ میں چیخ اٹھا۔ آنکھ کھلی تو میں ندی کے کنارے تھا۔ اسی پتھر کے ساتھ ٹیک لگائے۔ شام ہو چکی تھی۔ لوگ میلے سے لوٹ رہے تھے۔ میرے ہاتھ خالی تھے۔ آج برسوں بعد بھی، جب ندی کے پاس سے گزرتا ہوں، تو یوں لگتا ہے کہ وہ دوشیزہ کہیں پانی کے عکس میں موجود ہے۔ شاید وہ کوئی اور نہیں تھی۔ شاید وہ میری نیت تھی۔ میرا انجام۔ یا پھر وہ یاد... جو ہر انسان کو ایک بار ضرور ملتی ہے.... یاد دلاتی ہے کہ راستے صرف شاہ پور کو نہیں جاتے، کچھ راستے انسان کو اس کے اصل چہرے تک لے جاتے ہیں۔ یاد ہے نا...؟

☆☆

تنہائی

تنہائی کوئی اچانک نازل ہونے والا حادثہ نہیں، یہ آہستہ آہستہ اختیار کی جانے والی ایک عادت ہے۔ ایسی عادت جو انسان کے اندر جگہ بناتی ہے، پھر پورا وجود اپنے قبضے میں لے لیتی ہے۔ غفور کاکا شوق پتھری کا وہ فرد تھا جس کے حصے میں زندگی کم اور یادوں کی کثرت آئی تھی۔ وہ بستی میں موجود تھا، مگر بستی کے وقت سے کٹ چکا تھا۔

اس کا گھر گاؤں کے آخری کنارے پر تھا، وہاں جہاں راستے ختم ہو جاتے ہیں اور قدم خود سے رک جاتے ہیں۔ کچی دیواروں پر نمی اور وقت نے مل کر ایسے نقش بنائے تھے جیسے کسی خاموش کہانی کے حاشیے۔ دروازہ ہر بار کھلتے ہوئے ایک مانوس سی آواز نکالتا، گویا کسی پرانے سوال کو دہرا رہا ہو۔ صحن میں کھڑا سوکھا اخروٹ اب درخت نہیں رہا تھا، بلکہ ایک ٹھہری ہوئی علامت بن چکا تھا.... ایسی علامت جو کسی گزرے موسم کی گواہی دیتی ہے۔

غفور کاکا گھڑی نہیں دیکھتا تھا۔ اس کے لیے وقت بہتا نہیں تھا، رکا ہوا تھا۔ اس کی صبحیں کسی ادھوری یاد سے شروع ہوتیں اور شامیں کسی نامکمل آواز پر ختم ہو جاتیں۔ وہ دن کے اوقات میں کم اور وقت کے اندر زیادہ جیتا تھا۔ وہ اکثر ٹوٹی چارپائی پر بیٹھ کر اپنے ہاتھوں کو دیر تک دیکھتا رہتا، جیسے ان ہتھیلیوں میں کبھی کوئی مقصد رکھا گیا ہو جو اب دھیرے دھیرے مٹ چکا ہے۔

''انسان چیزیں نہیں کھوتا،'' وہ خود سے کہتا، ''وہ خود کو آہستہ آہستہ چھوڑ دیتا ہے۔''

گاؤں کے لوگ کہتے تھے غفور کاکا خاموش ہیں، مگر خاموشی اس کی زبان تھی۔ وہ اپنی مرحوم بیوی سے باتیں کرتا، بیٹے کو آواز دیتا، اور کبھی ان چہروں کو بھی یاد کر لیتا جو وقت کے ساتھ بستی سے نکل گئے تھے۔ وہ باتیں کسی سے نہیں کرتا تھا، مگر ان سے بھی نہیں بھولتا تھا۔

شام کے وقت وہ چارپائی کو ذرا سا آگے سرکا لیتا۔ یہ اس کا روز کا سفر تھا..... ایک ایسا سفر جس میں فاصلہ نہیں، صرف ارادہ ہوتا ہے۔ شاید وہ ہر دن کسی ایسے مقام کے قریب جانا چاہتا تھا جہاں سوال ختم ہو جاتے ہیں۔ یا شاید وہ صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا وہ اب بھی اسی جگہ موجود ہے۔

کبھی کبھار بچے شرارت میں اس کے دروازے پر کنکر پھینک کر بھاگ جاتے۔ غفور کاکا دروازہ کھولتا، خالی گلی کو دیکھتا، اور ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر ٹھہر جاتی۔ اس مسکراہٹ میں نہ خوشی ہوتی، نہ شکوہ..... بس ایک خاموش اعتراف کہ وہ اب بھی اس دنیا کا حصہ ہے، اگرچہ غیر ضروری سا۔

گاؤں کے میلے، جنازے، عیدیں..... سب اس کے لیے ایک ہی رنگ میں ڈھل چکے تھے۔ کیونکہ جس شخص کے اندر وقت رک جائے، اس کے باہر موسم بدلنے کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ تنہائی نے اسے توڑا نہیں تھا، بلکہ رفتہ رفتہ خالی کر دیا تھا۔

ایک دن اس نے صحن میں کھڑے سوکھے اخروٹ کو چھوا۔ چھال انگلیوں کے نیچے سے جھڑنے لگی۔ وہ دیر تک اپنے ہاتھ پر لگی گرد کو دیکھتا رہا، پھر دھیرے سے بولا ”ہم بھی ایسے ہی جھڑتے ہیں... کسی موسم کے بغیر۔“

اگلی صبح سورج حسبِ معمول شوق پتھری کی پہاڑیوں سے نکلا۔ گاؤں جاگا، دروازے کھلے، مویشی چراگاہوں کی طرف بڑھے لوگ کھیتوں میں کام کرنے نکلے، بچے اسکول جانے لگے.... مگر غفور کاکا کے گھر کا دروازہ بند رہا۔ نہ چارپائی سرکی، نہ کوئی سرگوشی

فضا میں گھلی۔شام تک خاموشی نے بھی تھکن محسوس کی تو کسی نے ہمت کر کے دستک دی۔پھر دروازہ کھولا گیا۔اندر سب کچھ اپنی جگہ تھا۔چارپائی ویسے ہی رکھی تھی۔سوکھا اخروٹ صحن میں کھڑا تھا۔ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔

غفور کاکا.....شاید وہ پہلے ہی کسی ایسے وقت میں جا چکا تھا جہاں انتظار کی ضرورت نہیں رہتی،اور تنہائی محض ایک لفظ بن کر رہ جاتی ہے۔شوق پتھری کی خاموشی نے اس دن کوئی گواہی نہیں دی،جیسے وہ بھی کسی غیر کہی ہوئی بات کے حق میں ہو۔

☆☆

انصاف بک گیا

رسول خان کے ہاتھ میں اراضی کے تمام قانونی کاغذات تھے۔مگر فیصلے کی مہر گُلہ ملک کے نام لگی۔

عدالت میں ہوا ایک لمحے کو ٹھہر گئی۔ رسول خان نے احتجاج کیا، لیکن اس کی آواز فائلوں کے بوجھ تلے دب گئی۔

کورٹ کے ہجوم میں بیٹھا ایک پاگل کھڑا ہوا بے خوفی سے اس نے کلکٹر کی طرف دیکھا اور بولا ''یہ ناانصافی... کتنے میں بیچی ہے؟''

کورٹ میں خاموشی چھا گئی قلم رک گئے ،کاغذات کانپے،

اور انصاف شرمندہ ہو کر فائلوں کے نیچے دب گیا۔

☆☆

بدچلن عورت

مولانا صاحب نے جب جانہ کے ہاتھوں کو دبالیا تو کمرے کی دیواریں جیسے سہم گئیں۔

جانہ نے سسکتے ہوئے ہاتھ چھڑایا، ایک قدم پیچھے ہٹی اور دھیمی مگر فیصلہ کن آواز میں بولی

''مولانا صاحب، میں بیوہ ضرور ہوں.... مگر بدچلن نہیں۔''

خاموشی نے فتویٰ نہیں دیا،

مگر مولانا کی نگاہیں پہلی بار شرمندہ ہوگئیں۔

☆☆

کوٹھے پر

اشوک شام ڈھلنے کے بعد کوٹھے پر چڑھا تھا۔ سیڑھیاں مانوس تھیں، قدموں میں بے فکری تھی۔

اچانک ایک چہرہ سامنے آیا.... وہ ان کی سگی بہن تھی۔ ہاتھ اٹھا۔ آواز گونجی۔ چہرہ جھک گیا۔

تب اس نے کہا ''میں یہاں نہیں رہتی۔ میں تو تمہارے قدموں کے نشان ڈھونڈتی یہاں تک پہنچی ہوں۔''

کوٹھا خاموش رہا۔ سیڑھیاں اپنی گنتی بھول گئیں۔ اور وہ......

وہ پہلی بار نیچے اترتے ہوئے اوپر نہیں دیکھ سکا۔

☆☆

بدچلن عورت

مولانا صاحب نے جب جانہ کے ہاتھوں کو دبالیا تو کمرے کی دیواریں جیسے سہم گئیں۔

جانہ نے سسکتے ہوئے ہاتھ چھڑایا، ایک قدم پیچھے ہٹی اور دھیمی مگر فیصلہ کن آواز میں بولی

''مولانا صاحب، میں بیوہ ضرور ہوں.... مگر بدچلن نہیں۔''

خاموشی نے فتویٰ نہیں دیا،

مگر مولانا کی نگاہیں پہلی بار شرمندہ ہو گئیں۔

☆☆

کوٹھے پر

اشوک شام ڈھلنے کے بعد کوٹھے پر چڑھا تھا۔ سیڑھیاں مانوس تھیں، قدموں میں بے فکری تھی۔

اچانک ایک چہرہ سامنے آیا.... وہ ان کی سگی بہن تھی۔ ہاتھ اٹھا۔ آواز گونجی۔ چہرہ جھک گیا۔
تب اس نے کہا ''میں یہاں نہیں رہتی۔ میں تو تمہارے قدموں کے نشان ڈھونڈتی یہاں تک پہنچی ہوں۔''

کوٹھا خاموش رہا۔ سیڑھیاں اپنی گنتی بھول گئیں۔ اور وہ......
وہ پہلی بار نیچے اترتے ہوئے اوپر نہیں دیکھ سکا۔

☆☆

بشیر اطہر کے اس مجموعے میں کئی افسانے مثلاً ''کون مرا''، ''بالیاں'' اور ''سفر تنہائی کا'' وغیرہ خونی رشتوں کی حقیقت کو آشکار کرتا ہے۔ ان افسانوں میں افسانہ نگار نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ کبھی رشتوں کی زنجیر مضبوط نہیں ہوتی، کچھ رشتوں میں محبت، اپنوں کی قربت اور ہمدردی کا جذبہ برقرار نہیں رہتا۔ ''سفر تنہائی کا'' میں والدین اپنے بچوں کے بہتر اور روشن مستقبل کے لیے انہیں ولایت بھیج دیتے ہیں، بدلے میں انھیں مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا، یہاں تک کہ بچوں کے ہاتھوں کی مٹی بھی نصیب نہیں ہوتی۔

''بند کمرہ'' ایک نفسیاتی نوعیت کی کہانی ہے جس میں انسانی خواہشات کو قابو میں رکھنے کی تلقین کی گئی ہے۔ بشیر اطہر کے دیگر افسانے بھی موضوع کے اعتبار سے ایک پیغام دیتے ہیں۔ ان کی کہانیاں سماجی، معاشی اور اقتصادی پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے۔ چوں کہ انسان میں سماجی اور اقتصادی اعتبار سے لچک ہونا ضروری ہے، معمولی کمزوری بھی اس کے وقار کو ٹھیس پہنچا سکتی ہے۔ بشیر اطہر نے ان چیزوں کو بڑی خوبی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔

''زخم جو بولتے ہیں'' بشیر اطہر کی افسانہ نگاری کی پہلی سیڑھی ہے، گویا وہ جوں جوں زینے طے کرتے جائیں گے، اتنا ہی اُن کے افسانوں میں گہرائی و گیرائی اور فنی پختگی بھی پیدا ہوتی جائے گی۔ جہاں موضوعی سطح پر ان کے افسانوں میں تنوع پیدا ہوگا وہیں تکنیکی لحاظ سے بھی وہ مزید کئی عمدہ افسانے پیش کر سکتے ہیں۔ جہاں تک فاضل افسانہ نگار کی زبان و بیان کا تعلق ہے تو اس میں موصوف دیگر نوجوان افسانہ نگاروں سے کافی حد تک بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

بشیر اطہر جس لگن اور محنت کا مظاہرہ کر رہے ہیں، اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب وہ نمائندہ نسل کے افسانہ نگاروں میں ایک اہم مقام بنانے میں کامیاب ہوں گے۔

میں بشیر اطہر کو ان کے مجموعے ''زخم جو بولتے ہیں'' پر صمیم قلب سے مبارک باد پیش کرتا ہوں اور ان کے روشن مستقبل کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں۔

ڈاکٹر غلام نبی کمار

ZAKHM JO BOLTAY HAIN

(SHORT STORIES)

By: Bashir Athar

GNK PUBLICATIONS

Website : www.gnkpublications.com

Email : gnkpublications@gmail.com

Mobile : 7006738304, 9541123110

ISBN:978-93-47359-37-8

9 789347 359378

₹ 499

GNK Publications GNK URDU gnk.publications GnkPublications